اکبر اور اقبال





ڈاکٹر غلام حسین ذوالفق

اکبر اور اقبال

تالیف

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
ایم - اے ، پی ایچ - ڈی
ایسوسی ایٹ پروفیسر ، شعبۂ اردو ۔ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

مکتبۂ عالیہ • لاہور

باراوّل : ۱۹۷۷ء

اکبر اور اقبال

تالیف:۔۔۔۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
ناشر:۔۔۔۔ الطاف حسین
مطبع:۔۔۔۔ حبیب پرنٹرز لاہور
سرِورق:۔۔۔۔ نوید انجم
قیمت
۱۳/۵۰

یکے از مطبوعات
مکتبۂ عالیہ • ایبک روڈ (انار کلی)، لاہور

مندرجات

پیش لفظ

چودہ پندرہ سال پہلے "اکبر، پیش روِ اقبال" لکھا گیا تھا جو "بزمِ اقبال" کے سہ ماہی مجلہ "اقبال" اپریل ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ بعد میں یہی مضمون کسی قدر ترمیم و اضافے کے ساتھ "نقدِ اکبر" میں شامل کیا گیا۔ اس دوران میں مزید مواد فراہم ہوتا رہا اور کچھ نئی معلومات سامنے آتی رہیں۔ اگرچہ تصویر کا ایک رُخ ابھی تک پوری طرح سامنے نہیں آسکا ہے، یعنی اکبر کے خطوط بنام اقبال (سوائے دو خطوں کے) دستیاب نہیں ہو سکے۔ اسی طرح اقبال کے خطوط اکبر کے نام بھی، ماسوا اقبال نامہ حصۂ دوم والے سولہ خطوط کے، نایاب ہیں۔ یہ سارے خطوط مل جائیں تو ہماری ادبی اور فکری تاریخ کا ایک باب مکمل ہو جاتا ہے۔ بہرکیف، اکبر اور اقبال نے دوسرے احباب کے نام خطوں میں بھی ایک دُوسرے کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے اور اپنے اپنے تاثرات ریکارڈ کئے ہیں۔ اس سارے مواد کو پیشِ نظر رکھ کر دونوں شخصیتوں کے روابط اور فکری ہم آہنگی کی ایک اچھی خاصی رُوداد تیار ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر تالیف "اکبر و اقبال" اسی نُقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔

اکبر، پیش روِ اقبال، اس تالیف کا باب اوّل ہے جسے مزید ترمیم و اضافے کے ساتھ نئی شکل دی گئی ہے۔ باقی معلومات دُوسرے ابواب میں پیش کی گئی ہیں جن میں اکبر اور اقبال کی باہمی مراسلت بھی ہے اور دونوں حضرات نے دیگر احباب کے نام خطوط میں ایک دوسرے

کے بارے میں جو اہم باتیں لکھی ہیں وہ بھی ضروری حواشی کے ساتھ شامل کر دی گئی ہیں۔ آخر میں ضمیمے کے طور پر "نیوایرا" میں اقبال کا وہ شذرہ بھی درج کر دیا گیا ہے جو "اکبر پیش روِ اقبال" لکھتے وقت مجھے دستیاب نہ ہوا تھا اور جس کے سلسلے میں راقم نے مولانا عبدالماجد دریابادی (مرحوم) سے خط کتابت بھی کی تھی۔ بعد میں "نیوایرا" میں اقبال کے شائع شدہ شذرات سید عبدالواحد کی مرتبہ : Thoughts and Reflections of IQBAL (1964) میں چھپ کر منظرِ عام پر آ گئے۔ اب سید صاحب کے شکریئے کے ساتھ میں متعلقہ شذرے کو "اکبر و اقبال" میں شامل کر رہا ہوں۔

جب "اکبر پیش روِ اقبال" شائع ہوا تھا تو میں نے اس کا ایک آف پرنٹ نسخہ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اُنہوں نے صدق جدید (لکھنؤ) میں اس پر تبصرہ فرما کر میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ مولانا مرحوم نے اکبر کے بارے میں میرے ایک آدھ اور مضمون پر بھی جو اُن کی نظر سے گذرا، تعریفی کلمات ارشاد فرمائے۔ افسوس کہ موانعات کے باعث میں اُن کی خدمت میں "نقدِ اکبر" ارسال نہ کر سکا اور اس کے صلے سے محروم رہا۔ اور اب "اکبر و اقبال" شائع ہو رہی ہے تو مولانا راہیٔ مُلکِ بقا ہو چکے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ط

اقبال صدی کے سلسلے میں میری یہ ایک حقیر سی کوشش ہے جسے میں بصد احترام و عقیدت

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم و مغفور
کے نام نامی سے اِنتساب

کرتا ہوں، کیونکہ اُن کے، دونوں بزرگوں (اکبرؒ و اقبالؒ) سے گہرے مراسم تھے اور وہ مجھ پر بھی شفقت فرماتے تھے۔ اس طرح اُن کے واسطے سے لسان العصر اور ترجمانِ حقیقت دونوں کے حضور اپنا یہ نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے میں اطمینانِ قلب محسوس کرتا ہوں!

نشیمن، لاہور / ۳/اکتوبر ۱۹۷۷ء　　　　غلام حسین ذوالفقار

بابِ اوّل

اکبؔر پیش روِ اقبال

اکبر الٰہ آبادی[1] اقبال کے پیش رو بھی تھے اور ایک حد تک ہم عصر یا معاصر، اکبر بھی کیونکہ بیسویں صدی کے رُبعِ اوّل کا زمانہ، جو تاریخی عوامل کے اعتبار سے برِ عظیم ہند و پاک کے لئے بڑا ہی اہم زمانہ تھا، ان دونوں فنکاروں کی فکر و نظر کا محور بنا رہا۔ ہر چند کہ اوّل الذکر فن کار عمرِ طبیعی کی منزلیں طے کر کے سفرِ آخرت کی تیاری کر رہا تھا اور آخر الذکر فن کار اپنی حیات اور فن دونوں کے اعتبار سے شباب و شیب کی وادیوں میں گامزن تھا، با ایں ہمہ مشرق کے ان دو عظیم فنکاروں اور مفکروں نے ایک دوسرے کو پہچانا، قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ایک دوسرے کی شخصیت اور فکر و فن سے متاثر و محظوظ بھی ہوئے۔ ہم اس باب میں اِنہی روابط و اثرات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

اکبر اور اقبال میں فنی مماثلتیں کم سے کم تر سہی، تاہم مقاصد کا اشتراک اور بہت حد تک فکر و نظر کی وحدت و یک جہتی دونوں فن کاروں کے کلام و پیام میں بیش از بیش ہے زمانے کی ذرا سی تقدیم و تاخیر کے باوصف دونوں فنکاروں کا موضوعِ بحث کم و بیش ایک ہی

---

[1] سید اکبر حسین اکبؔر: ولادت، بارہ شوال ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء، وفات الٰہ آباد ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال: ولادت، سیالکوٹ ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء - وفات، لاہور ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء .

سمت الرّاس کی نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی مسئلۂ توحید، عشقِ الٰہی وعشقِ رسولؐ، اسلام سے والہانہ لگاؤ، احیائے ملّت، مشرق کی سیاسی وذہنی محکومی کا تلخ احساس، اقوامِ مشرق کو درسِ خودشناسی، غلبۂ مغرب کے زیرِ اثر جو نئی لادینی سیاست، تہذیب، ثقافت، تعلیم اور معاشرت مشرق میں جڑ پکڑ رہی تھی اُس کی تکذیب وتخریب اور مغرب کے علمی اکتشافات اور سائنسی ایجادات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفے کے نت نئے بدلتے ہُوئے مادی افکار اور سطحی وگمراہ کن خیالات کی پردہ دری! بنابریں یورپ کے تیز رندوں کی شکایت سے لے کر ملّت کے احیائے نَو کے تصوّر تک دونوں فنکاروں کے افکار میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتوحات کے بعد لارڈ میکالے کی تعلیمی حکمتِ عملی کے کچے چٹھے کو، جس پر محکوم ہندوستان کا آئندہ نظامِ تعلیم استوار ہوا، ایک شعر میں بیان کر کے دریا کو کُوزے میں سمو دیا ہے:

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رَندا ہے

اور جب اس رَندے نے اچھے اچھوں کو چھیل کر ہموار کرنا شروع کر دیا اور صُورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی کہ بقول میر تقی میرؔ:

ہم ہُوئے تم ہُوئے کہ میرؔ ہُوئے اُس کی زُلفوں کے سب اسیر ہُوئے

تو پھر اقبال کی باری آئی کہ وہ اس صُورتِ حال کا جائزہ لیں اور نئی تہذیب کے گندے انڈوں اور یورپ کے تیز رَندوں کی حقیقت وماہیّت کو طشت از بام کریں:

میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ نہایت تیز ہیں یورپ کے رَندے

اکبر اور اقبال کے اِن دونوں شعروں کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے، یعنی محکوم ملک کا نیا نظامِ تعلیم جو استعماری مقاصد کی تکمیل کے لئے یہاں نافذ کیا گیا تھا۔ البتّہ اظہار و بیان میں جو تھوڑا بہت فرق پیدا ہو گیا ہے وہ ان دونوں فن کاروں کے زمانے اور ماحول کی تقدیم وتاخیر کو واضح کرتا ہے۔ اکبر کو جس دور سے سابقہ پڑا اُسے معاشرتی تبدیلیوں کے

اعتبار سے عہدِ تداخُل بھی کہا جاتا ہے اور دورِ اصلاح بھی — یعنی ۱۸۵۷ کے بعد ملک جس نئی صورتِ حال سے دوچار ہُوا اُس سے ہم آہنگی پیدا کر کے قومی اصلاح و فلاح کے لئے منصوبہ بندی کا دَور۔ اگر واضح تر لفظوں میں کہا جائے تو یہ دور سیاسی محکومی کے بعد برِ عظیم کے باشندوں کی ذہنی محکومی، فکری انتشار اور مغرب سے مرعوبیت کا دور تھا جس میں کچھ اصلاحی تحریکیں نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کی تگ و دَو کر رہی تھیں۔ سر سید احمد خان کی علی گڑھ تحریک بھی انہی حالات میں اُبھری اور اس دَورِ ابتلا میں ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کر کے اُن کی معاشرتی و معاشی حالت سُدھارنے، نیز حکومت اور مسلمانوں میں مفاہمت پیدا کرنے کی سعی و کاوش کرنے لگی۔ علی گڑھ تحریک کے حُسن و قبح پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور شاید ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس مسئلے کو زیرِ بحث لایا جائے، لیکن چونکہ اکبر کو علی العموم سر سید اور اُنکی تحریک کے حریف کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اسلئے یہاں اِتنا تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ اکبر نہ تو سر سیّد کی ذات کے مخالف تھے اور نہ ہی اُنکی اصلاحی تحریک کے حریف تھے۔ تاہم وہ ایک حسّاس شاعر اور باشعور فن کار کی حیثیت سے دورِ اصلاح یا عہدِ تداخُل کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کر کے کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا قرار دے کر ملک و قوم کو نتائج و عواقب سے آگاہ کر رہے تھے۔ سر سیّد احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے بارے میں اکبر کا احساس کم از کم یہ ضرور تھا:

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ سیّد سے
قفس میں ہیں تو اسی اڈّے کو چھوڑ جائیں کہاں؟

بہرکیف اُنیسوں صدی کے ربعِ آخر میں علی گڑھ تحریک کے ایک بے لاگ نقّاد کی حیثیت سے اکبر نے اُن تازہ وارد معاشرتی قباحتوں کی نشاندہی ضرور کی جو اکثر مصلحین کی نظروں سے اوجھل تھیں (اور جن کا اعتراف بالآخر سر سیّد، محسن الملک، وقار الملک، نذیر احمد، حالی وغیرہ کو بھی کرنا پڑا اور شبلی نعمانی تو اس کے خلاف ایک بہت بڑے ردِّ عمل

کی حیثیت رکھتے ہیں)۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اکبر کے اندیشے حقیقت کے رُوپ میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے رہنماؤں نے بھی اپنی محنت و کاوش کے تلخ ثمرات کو بچشمِ خود ملاحظہ کیا اور اہلِ نظر کو اکبر کے کلام و پیام کی قدر و قیمت کا احساس ہوا، چنانچہ اُسی زمانے میں "مخزن" کے صفحات پر (سیّد غلام بھیک نیرنگ کی طرف سے) اُن کیلئے "لسان العصر" کا لقب تجویز ہوا اور یہ لقب اتنا مقبول ہوا کہ اکبرؔ ملک بھر میں "لسان العصر" کے نام ہی سے یاد کیے جانے لگے اور اُن کی شخصیت خاص و عام کا مرجع بن گئی۔

ردِّعمل کا یہی دور تھا جب اقبال کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ابتدائی دور کے جذبات انگیز کلام کے بعد اقبال حصولِ تعلیم کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ چلے گئے۔ وہاں جو کچھ اُنہوں نے دیکھا اور محسوس کیا وہ ایک الگ بحث ہے۔ خود اُن کے الفاظ میں "یورپ نے مجھے مسلمان بنادیا" بہرکیف یورپ سے ۱۹۰۸ء میں واپسی کے بعد اقبال کی شاعری بھی اسی ردِّعمل کی ترجمان بن گئی۔[۱] گویا یہاں سے اکبر اور اقبال کے ذہنی فاصلے بھی بہت کم ہو گئے اور دونوں فنکاروں نے ایک دُوسرے کی شخصیت میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔

روابط کی ابتدا

اکبر اور اقبال کے روابط کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ اس سلسلے کی ابتدائی

۱۔ بعض لوگ بے خبری میں اقبال کو علی گڑھ تحریک سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات محلِ نظر ہے ـــــــ اگر اقبال کے ابتدائی دور کی ایک نظم "سیّد کی لوحِ تُربت پر" ("بانگِ درا" صفحہ ۴۲) کو اس خیال کی تقویت کے لئے پیش کیا جائے تو "فردوس میں ایک مکالمہ" ("بانگِ درا" صفحہ ۲۷۶) اس خیال کی تردید کے لئے موجود ہے۔ خود اقبال نے پروفیسر ایم۔ شریف کے نام اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۲۵ء) میں اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ "عام طور پر علی گڑھ تحریک سے میرا کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔" (بحوالہ "اقبال نامہ" حصہ دوم، صفحہ ۲۳۳)۔

کڑیوں کا بننا اب ذرا مشکل بات ہے۔ غالباً دونوں فن کار ایک دُوسرے کے کلام کے ذریعے غائبانہ طور پر پہلے متعارف ہُوئے۔ شاید "مخزن" کو بھی اس غائبانہ تعارف میں کچھ دخل ہو۔ بہر صورت خط و کتابت اور میل ملاپ کا سلسلہ اقبالؔ کی یورپ سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد شروع ہوا۔ جیسا کہ شروع میں مذکور ہوا بیسویں صدی کی ابتدا میں ملک کی سیاسی و عمرانی فضا میں جو ایک ردِّعمل سا پیدا ہوا اُس کو تیار کرنے میں علاوہ دیگر خارجی و داخلی محرکات کے اکبر الٰہ آبادی کے افکار و اشعار نے بھی بڑا حصّہ لیا تھا۔ اگرچہ بعد میں شبلیؔ بھی اس ذہنی بیداری کے علمبردار بن گئے تھے لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب سر سیّد کی وفات (۱۸۹۸) کے بعد وہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے الگ ہوئے اور چند برس ریاست حیدر آباد کی ملازمت میں گذارنے کے بعد اُنھوں نے ندوۃ العلماؔ کی قیادت سنبھالی۔ بہرکیف اقبال بھی اس ذہنی بیداری اور ردِّعمل کی فضا سے بڑے متاثر تھے۔ یورپ سے واپسی پر اُن کی فکر و نظر میں جو انقلاب پیدا ہوا اُس میں زمانۂ قیام یورپ کے مطالعہ و مشاہدہ کے علاوہ برِّعظیم پاک و ہند کی اس فکری تحریک کا بھی بڑا حصّہ ہے جس کی رُوح و رواں اکبر الٰہ آبادی تھے۔ اس اثر پذیری کا اوّلین ثبوت ہمیں اقبال کے اُس انگریزی خُطبے سے ملتا ہے جو اُنھوں نے ۱۹۱۰ کے آغاز سرما میں سٹریچی ہال ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں دیا تھا۔[۱]

---

[۱] اصل انگریزی خطبہ راقم کو دستیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ مولانا ظفر علی خان نے اس کا جو ترجمہ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے کیا تھا وہ نظر سے گذرا ہے ــــ ظفر علی خان کا یہ ترجمہ اُن کے ماہوار رسالے "پنجاب ریویو" بابت مارچ و اپریل ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں اسے ایک کتابچے کی صورت میں بھی چھاپا گیا۔ یہ ترجمہ شدہ مضمون مولانا ظفر علی خان نے مئی ۱۹۱۱ء میں برکت علی اسلامیہ ہال (لاہور) میں ایک جلسے میں بھی پڑھا جو اسی مقصد کے لئے منعقد ہوا تھا۔ اقبال خود بھی اس جلسے میں موجود تھے۔

اس خطبے میں اقبال نے برِ عظیم کی اسلامی معاشرتی زندگی، علی الخصوص نئی تعلیم یافتہ پود کی ذہنی و جذباتی حالت کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اُس میں اکبر کے اثرات خاصے نمایاں ہیں۔ ذیل کا ٹکڑا تو اس امر کی واضح طور پر شہادت دے رہا ہے:

"موجودہ نسل کا نوجوان مُسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے، جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کے لحاظ سے بھی میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے، اور وہ بھی اُس صورت میں کہ اُس کی خالص دنیوی تعلیم نے اُس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی خیالات کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اُس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکزِ ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے ——— اس حقیقت کو مولانا اکبر سے زیادہ واضح طور پر کسی نے بیان نہیں کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظرِ غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اُٹھتے ہیں:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کا کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اُس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارے میں سر سید احمد خاں (مرحوم) کے ساتھ مدّت العمر لڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اُس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔"[1]

اسی خطبے میں ایک دوسری جگہ اکبر کے فکر و فن کے بارے میں کہتے ہیں:

۱۔ "پنجاب ریویو" بابت مارچ و اپریل ۱۹۱۱ صفحہ ۱۰-۱۱۔

"جناب مولانا نے اکبر الٰہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانہ پیرایہ میں اُن قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہیں جو آجکل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ اُن کے کلام کے ظریفانہ لہجے پر نہ جائیے، اُن کے شباب آور قہقہے اُن کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اُس وقت تک آپکو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ آپ اُن کا مال خریدنے کے لئے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں۔"[۱]

یہ پہلا تحریری ثبوت ہے جو اکبر سے اقبال کے متاثر ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ نیز دونوں فنکاروں کے روابط کے سلسلے کی ابتدائی کڑیوں کو ملاتا ہے۔

اس کے بعد چند مکتوبات میں دونوں فنکاروں کے باہم متعارف یا ہم کلام ہونے اور ایک دوسرے کی شخصیت میں کشش و جاذبیت محسوس کرنے کے ثبوت ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس وقت تک جو مکتوبات دستیاب ہوئے ہیں اُن میں پہلا مکتوب اقبال بنام اکبر مؤرخہ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کا ہے۔ اس مکتوب کے مندرجات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں شخصیتوں کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس خط میں اقبال نے اکبر کے ایک خط کے موصول ہونے کی رسید بھی دی ہے[۲] اقبال کا یہ مکتوب اس اعتبار سے بڑا اہم ہے

۱۔ "پنجاب ریویو" بابت مارچ و اپریل ۱۹۱۱ء صفحہ ۸۔

۲۔ اقبال نے اکبر کے نام جو خطوط لکھے اُن میں سے سولہ خطوط "اقبالنامہ"، حصہ دوم میں شامل ہیں۔ اکبر نے اقبال کے نام جو خطوط لکھے اُن میں سے صرف دو خط دستیاب ہیں جو اقبال کی رحلت کے بعد "شیرازہ" کے اقبال نمبر میں شائع ہوئے اور بعد میں "اقبالنامہ" مرتبہ چراغ حسن حسرت میں شامل کئے گئے باقی خطوط کا ابھی کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہیں؟ اکبر اور اقبال کے روابط کے سلسلے میں خطوط اکبر کی یہ گمشدہ کڑی نہایت اہم ہے۔ راقم کے خیال میں اقبال نے ان خطوط کو محفوظ رکھا (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ اس میں انہوں نے اکبر کو اس نگاہ سے دیکھا ہے جس نگاہ سے ایک مُرید اپنے پیر کو دیکھتا ہے"۔
اور آرزوئے ملاقات کے ساتھ ساتھ "اپنے دل کو چیر کر" اپنے مُرشد کے سامنے رکھ دینے کی
خواہش کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مخدوم و مکرم جناب قبلہ سیّد صاحب، السلام علیکم۔ کل ظفر علی خاں صاحب سے
سُنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی۔ اُسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں عریضہ
خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ مِلا۔ دست بدعا ہوں کہ

(حاشیہ آمدہ از گذشتہ صفحہ)

ہوا تھا۔ ۹ر نومبر ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں ("اقبالنامہ" حصہ دوم صفحہ ۳۷) اقبال نے اکبر کے خطوط
کے سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار جس انداز میں کیا ہے اُس سے اس خیال کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے
اکبر کی وفات کے بعد جب مختلف اصحاب نے دہلی، لکھنؤ اور لاہور سے مکاتیبِ اکبر کے مجموعے شائع
کئے اُس وقت اقبال بھی خطوط کے اُس مجموعے کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو اکبر نے انہیں
وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ مرزا سلطان احمد اپنے مرتبہ "مکاتیبِ اکبر" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:
"سُنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ حضرت اکبر کے جو خطوط اُن کے نام ہیں
اُن کا ایک انتخاب معہ مقدمہ کے شائع کیا جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں تو وہ ادبی دُنیا
پر ایک بڑا احسان کریں گے، جیسا کہ "مکاتیبِ اکبر" و "خطوطِ اکبر" دو مختلف مجموعے اِس سے پہلے
دہلی و لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں"۔ اس تحریر کی مزید تائید ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کے ایک بیان
سے ہوتی ہے۔ جب راقم نے اُن سے اس بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ جب
"بانگِ درا" کا پہلا ایڈیشن چھپ رہا تھا اُس وقت اقبال، اکبر کے خطوط کا مجموعہ چھاپنے کی فکر میں
بھی تھے۔ لیکن پھر معلوم نہیں ہو سکا کہ ان خطوط کا کیا ہوا۔ اگر اقبال کے مسودات میں سے یہ خطوط
مِل جائیں اور کوئی اللہ کا بندہ انہیں شائع کر دے تو یہ ایک بہت بڑی علمی اور قومی خدمت ہوگی
حسرت مرحوم (مدیر شیرازہ) کو اس قیمتی مجموعہ کے صرف دو خطوط مل سکے (اور اب یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا
کہ انہیں یہ خطوط کہاں سے ملے یا کس نے دیئے)۔ اکبر کے کسی اور خط بنام اقبال تک اُن کی رسائی نہ
ہو سکی ورنہ وہ یہ نہ لکھتے "اکبر مرحوم کو غالباً علامہ اقبال سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا"۔
(اقبالنامہ مرتبہ حسرت، صفحہ ۱۳)
یہ دونوں خطوط "اکبر بنام اقبال" چوتھے باب میں پیش کئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپکو دیر تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان کے مسلمان اس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مُرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے ....[۱]

اس کے بعد ۹ر نومبر ۱۹۱۱ء کے خط میں اکبر کے دو خطوط کے موصول ہونے کی اطلاع دی گئی ہے ملاقات کے لئے بے قراری اور تڑپ بدستور ہے۔ مرشد کے خطوط تنہائی میں اقبال کے ندیم بن جاتے ہیں اور "پیرِ مشرق" سے فیض پانے کی تمنّا ایک انوکھے انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مخدومی ! السلام علیکم۔ آپ کے دونوں نوازش نامے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ الحمدللہ کہ جناب خیریت سے ہیں۔

ترکوں کی فتح کا مژدۂ جانفزا پہنچا۔ مسرت ہوئی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں رُوح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ میں ایک زبردست تمنّا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں۔ گو اس تمنّا کا موضوع مجھے ابھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لاہور کی بستی میں کوئی ہمدم دیرینہ نہیں۔ نام و نمود پر مرنے والے بہت ہیں۔ قومی جلسوں سے بھی پہلوتہی کرتا ہوں۔ ہاں! آپ کے خطوط

۱۔ "اقبال نامہ" حصّہ دوم، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، صفحہ ۲۵۔

جو میرے پاس سب محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا ہے کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجئے، مگر میں خود لمبا خط لکھنے سے گھبراتا ہوں، پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں۔ یہ ایک قسم کی رُوحانی خود غرضی ہوگی جس کا ارتکاب میرے نزدیک گناہ ہے۔ آپ کی مُلاقات کے لئے دِل تڑپ رہا ہے۔ خدا جلد کوئی سامان پیدا کرے۔ کیا آپ دربار کے موقع پر دہلی تشریف لائیں گے؟[1]

'زمیندار' میں یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ 'اُردو شاہنامہ' تلف ہوگیا۔ جو شعر اس میں سے شائع ہُوئے ہیں وہ بڑے زور کے ہیں:

رگِ موج سے خُون جاری کریں

اس مصرعہ پر تو فردوسی اور نظامی بھی رشک کرتے[2]

۱۔ خطوط میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اکبر اس موقع پر دہلی گئے تھے۔ البتہ "کلیاتِ اکبر" (حِصّہ دوم) صفحہ ۴۰۱ پر "دربار ۱۹۱۱ء" کے عنوان سے ایک قطعہ ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس موقعے پر دہلی گئے تھے۔ پہلا شعر ہے:

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار
حُکمِ حاکم سے ہُوا تھا اجتماعِ انتشار

اقبال غالباً اس موقعے پر دہلی نہیں جا سکے تھے۔

۲۔ اس نیم رزمیہ مثنوی کے کچھ بچے ہوئے اوراق ایک خاندانی بیاض میں محفوظ رہ گئے۔ اس میں سے کچھ منتخب اشعار (۱۲۴) "علی گڑھ میگزین" (اکبر نمبر) میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۸۷۷ء میں لکھی گئی۔ اس کا موضوع "جنگ روم و روس" ہے جو اس زمانے میں ترکوں اور رُوسیوں کے درمیان ہُوئی۔ مذکورہ شعر کا پہلا مصرع یہ ہے:

جو دریا پہ یہ تیر باری کریں

ہاشم طال عمرہ کو میری طرف سے بہت بہت پیار کیجیے۔[۱] میری رُوح کو اس نام سے ایک خاص تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کی عمر دراز کرے اور دین دُنیا میں اسے بامراد کرے۔ سکول کی خواندگی میں اس کا وقت ضرور ضائع ہوتا ہوگا، مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیرانِ مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے۔ یہی نظر صبغۃ اللہ ہے۔ (۱۳۸-۱۱)

اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیرانِ مشرق دُنیا میں نہ رہیں گے اور آئندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہونگے۔

میاں ہاشم! اب وقت ہے۔ اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیرِ مشرق سے لے سکتے ہو، لے لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ اس تربیت کے فیض سے زندگی بھر تمہاری رُوح لذت اُٹھائے گی!

خادم ـــــ اقبال ـــــ لاہور"[۲]

مُلاقات کا سلسلہ

انتظار کی گھڑیاں بالآخر ختم ہوتی ہیں اور ملاقات کا موقع نصیب ہوتا ہے۔ اقبال دیدارِ اکبر کی آرزو لئے جنوری ۱۹۱۳ میں الٰہ آباد پہنچتے ہیں۔ یہ پیر و مُرید کی پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات کے بارے میں اکبر اپنے ایک مکتوب (مؤرخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۱۳) بنام مرزا سلطان احمد علی لکھتے ہیں:

۱۔ اکبر الٰہ آبادی کا کمسن بیٹا ہاشم۔ اہلیہ کے انتقال (اکتوبر ۱۹۱۰ء) کے بعد اس بچے کی غور و پرداخت اکبر کے ذمے تھی۔ اکبر کو اس بچے سے خاص اُنس تھا۔ جون ۱۹۱۳ء میں ہاشم کا انتقال ہوگیا۔

۲۔ "اقبالنامہ" حصّہ دوم، صفحہ ۳۷-۳۹۔

"ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اُٹھائی۔ صرف چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے کو الٰہ آباد تشریف لاتے تھے۔ آپ صاحبوں کا کرم ہے، نیک دلی ہے، ورنہ میری کیا ہستی ہے:

چل بسے اسباب غفلت چشم عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

ڈاکٹر اقبال صاحب بلحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیات الٰہی میں سے ہیں۔ آپ نے بجا اُن کی مدح کی ہے۔ وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم فلاسفر نیک دل بزرگ کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا"۔[1]

اکبر و اقبال کی دوسری ملاقات ۷ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ہوتی ہے۔ اس ملاقات کے بارے میں اکبر اپنے دو مکتوبات، اوّل بنام مرزا سلطان احمد (مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۱۳ء) اور دوم بنام عبدالماجد دریاآبادی (مؤرخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء) میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

۱۔ بنام مرزا سلطان احمد

"پرسوں آپ کے دوست اور مدّاح ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بہ سلسلہ کانپور[2] مجھ سے ملنے کو تشریف لاتے تھے"۔[3]

۲۔ بنام عبدالماجد دریاآبادی:

"........ کل ڈاکٹر اقبال صاحب جو مجھ سے ملنے کے لئے تشریف

۱۔ "مکتوبات اکبر" بنام مرزا سلطان احمد، مطبوعہ کریمی پریس لاہور، صفحہ ۴۹۔

۲۔ سانحہ مسجد مچھلی بازار کانپور کے سلسلے میں۔ اس مقدمے کی پیروی کے لئے برِّ عظیم کے بعض نامور مسلمان وکلا نے اپنی اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ لاہور سے ڈاکٹر اقبال اور مرزا جلال الدین کانپور گئے تھے۔

۳۔ "مکتوبات اکبر" بنام مرزا سلطان احمد، صفحہ ۵۴۔

لائے تھے، دہلی گئے"۔[۱]

محولہ بالا خطوط کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دفعہ اقبال کا قیام ۷ سے ۹ ستمبر تک یعنی تین دن رہا۔ غالباً اُن کا قیام اکبر کے ہاں تھا۔ پہلا خط آمد کی اطلاع دیتا ہے، جانے کا نہیں بتاتا۔ دوسرا خط آمد کی تاریخ نہیں بتاتا، البتہ رُخصت ہونے کی خبر دیتا ہے۔ علاوہ بریں مرزا سلطان احمد کو خط مراد آباد سے لکھا گیا ہے اور عبدالماجد کو الٰہ آباد سے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اکبر ۹ ستمبر کو مراد آباد میں تھے اور ۱۰ ستمبر کو الٰہ آباد پہنچے۔ لیکن ماجد صاحب کے خط میں اس سفر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ الٰہ آباد اور مراد آباد کے درمیان بُعد مسافت کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات مشکل سی نظر آتی ہے۔ قیاس یہی ہے کہ مکتوبات اکبر میں سہو کتابت سے الٰہ آباد کی بجائے مراد آباد لکھا گیا ہے۔ اس لئے یہ ملاقات الٰہ آباد ہی میں ہوئی ہو گی۔[۲]

تیسری ملاقات ۲۹ فروری ۱۹۲۰ کو ہوئی ہے اس دفعہ بھی اقبال تین دن الٰہ آباد میں رہے اور اکبر کے مہمان رہے۔ اس ملاقات کی اطلاع اکبر اپنے مکتوب (مؤرخہ ۵ مارچ ۱۹۲۰) بنام خواجہ حسن نظامی میں یوں دیتے ہیں۔

"۲۹ فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے کسی مقدمے میں ضلع گیا کو گئے تھے۔"[۳]

۱۔ "خطوط مشاہیر" مرتبہ عبدالماجد دریا بادی، صفحہ ۴۸

۲۔ یہ مضمون ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا تھا اور راقم نے مذکورہ بالا تجزیے میں قیاساً یہ رائے قائم کی تھی۔ بعد میں صحیفہ کے اقبال نمبر (۲، ۱۹۷۳ء) میں اقبال کے خطوط بنام مہاراجہ کشن پرشاد چھپے تو اس قیاس کی تصدیق ہو گئی۔ البتہ یہ قیام تین روز کی بجائے دو روز کا تھا۔ اقبال یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں: "میں ستمبر کا قریباً کل مہینہ لاہور سے باہر رہا۔ پہلے مسجد کانپور کے مقدمے کیلئے گیا وہاں سے دہلی آیا اور حاذق الملک کے ہاں بغرض علاج مقیم رہا۔ الٰہ آباد بھی گیا وہاں دو روز مولانا اکبر کی خدمت میں رہا" ("صحیفہ" اقبال نمبر حصہ ۱، ۱۰۱) (۳) اس مقدمہ کی پیروی آرہ (ضلع گیا) میں ہوئی تھی۔ راقم کو ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کی زبانی معلوم ہوا کہ اس مقدمے میں ڈاکٹر اقبال سی آر داس کی فرمائش پر دو بمعاوضہ ایک ہزار روپیہ یومیہ تشریف لے گئے تھے۔

مجھ سے ملنے کو اس طرف گذرے۔ تین دن رہے۔ اُن میں مَیں نے بہت اپٹیکل نشاط طبع پایا۔ دُنیا بہ اُمیدِ قائم ہے"۔[۱]

یہ ملاقات ۲۹ر فروری سے ۲ر مارچ ۱۹۲۰ء تک رہی۔ اقبال ۲ر مارچ کو الٰہ آباد سے رخصت ہوتے۔ اکبر اپنے مکتوبات (مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۲۰ء) بنام عزیز لکھنوی میں لکھتے ہیں:

"مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ تین دن سے ڈاکٹر اقبال صاحب میرے مہمان تھے۔ ملنے آئے تھے۔ کسی مقدمے میں کسی ضلع میں گئے تھے۔ آج رخصت ہوئے، آپ کا بھی ذکر خیر رہا۔ میں ایک دن اچھا رہا تو چار دن بیمار۔ اسی سبب سے اب تک نہیں اٹھ سکا۔"[۲]

اسی ملاقات کے سلسلے میں اکبر اپنے ایک اور مکتوب (مورخہ ۱۹ر مارچ ۱۹۲۰ء) بنام عبدالماجد دریا بادی میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

"..... ڈاکٹر اقبال ملنے آئے تھے۔ تین دن رہ کر گئے۔ کہتے ہیں، میں آپ کے ساتھ رہتا تو ایک مجموعہ مرتب کرتا......"[۳]

غالباً اس ملاقات کے بعد لاہور پہنچ کر اقبال نے اکبر کو خط لکھا ہوگا جس میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہوگا۔ "کہتے ہیں" کے جملے سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ بہرحال اس قسم کا کوئی خط اقبال کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل نہیں۔ البتہ "حیاتِ اکبر" میں اقبال کے ایک خط کا اقتباس ملتا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ وہی خط ہوگا جس کا سطور بالا میں ذکر ہوا۔ اس خط کا اقتباس درج ذیل ہے:

۱۔ "خطوطِ اکبر" بنام خواجہ حسن نظامی، صفحہ ۱۶۳۔

۲۔ "مکاتیبِ اکبر" بنام عزیز لکھنوی، صفحہ ۱۹۲۔

۳۔ "خطوطِ مشاہیر" مرتبہ عبدالماجد دریابادی، صفحہ ۱۸۶۔

"آپ کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں۔ ان کو جمع کر لینا چاہیئے تاکہ آئندہ نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بڑی ضرورت ہے کہ ایک منشی کاغذ اور قلم دوات لے کر آپ کے پاس ہر وقت بیٹھے اور جو بات آپ فرمائیں نوٹ کر لے۔ اگر میں الہ آباد میں قیام کر سکتا تو آپ کے لئے وہی کام کرتا جیسا باسویل نے ڈاکٹر جانسن کے لئے کیا تھا۔"[۱]

مشرق کے ان دو عظیم فنکاروں اور صاحب بصیرت مفکروں کی یہ آخری ملاقات تھی جو اس عالم آب و گل میں ہوئی۔ اس سلسلۂ ملاقات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں اپنے مرشد سے ملاقات کی جو آرزو ابتدا میں پیدا ہوئی وہ بعض ناخوشگوار مباحث کے علی الرغم (جن کا ذکر آگے آئے گا) فزوں تر رہی اور وہ اس کیلئے ہمیشہ مواقع تلاش کرتے رہے کہ کسی نہ کسی بہانے وہ اس پیر مشرق کی صحبت سے فیضیاب ہو سکیں کیونکہ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ:

صحبتِ اہلِ صفا نور و حضور و سرور!

اکبر اور اقبال کی یہ تین ملاقاتیں تو کم و بیش وہ تھیں جو جامۂ عمل پہن سکیں، لیکن بعض ملاقاتوں کی تقریب پیدا ہو جانے کے باوجود وہ عملی صورت اختیار نہ کر سکیں۔ تاہم ان تشنۂ عمل ملاقاتوں سے اقبال کے شوق و ارادت کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ کم از کم ایسے دو مواقع کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جن کی تفصیلات اکبر اور اقبال کے بعض مکتوبات میں ملتی ہیں۔

اقبال اپنے مکتوب بنام مہاراجہ کشن پرشاد (مورخہ یکم فروری ۱۹۱۸ء) میں لکھتے ہیں:

۱۔ "حیاتِ اکبر" ترتیب عشرت حسین، تسوید مُلّا واحدی، صفحہ ۱۲۹۔

"...کل مولانا اکبر کا خط آیا تھا۔ خوب شعر کہتے ہیں۔ انشاء اللہ میں بھی مارچ میں ایم۔ اے کا امتحان زبانی لینے کے لئے الٰہ آباد جاؤں گا اور مولانا کی ملاقات سے شرف اندوز ہوں گا۔"[1]

اس کے بعد اقبال اپنے مکتوب (مورخہ ۹ مارچ ۱۹۱۸) بنام محمد نیاز الدین خاں میں لکھتے ہیں:

"......چند روز میں ایم۔ اے کا زبانی امتحان لینے کے لئے الٰہ آباد جانے والا ہوں اور یہ ممتحنی میں نے محض اس واسطے قبول کر لی کہ مولانا اکبر کی زیارت کا بہانہ ہو جائے گا۔"[2]

یہ ملاقات ۱۶ یا ۱۷ مارچ ۱۹۱۸ کو ہونی قرار پائی تھی۔ اس امر کی اطلاع اقبال نے اکبر کو اپنے ایک مکتوب (محررہ غالباً ۵ یا ۶ مارچ) میں کر دی تھی[3]۔ اکبر اس ملاقات کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کو اپنے مکتوب (مورخہ ۹ مارچ ۱۹۱۸) میں لکھتے ہیں:

"کل ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے کہ ۱۶ یا ۱۷ مارچ کو میں الٰہ آباد آؤں گا اور میرے ساتھ اور صاحب ہونگے جو صرف آپ ہی کے اشتیاق میں آتے ہیں۔ تین سال پیشتر اقبال صاحب میرے

۱۔ "شاد اقبال" مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، صفحہ ۸۰۔

۲۔ "مکاتیب اقبال" بنام خان محمد نیاز الدین خاں، مطبوعہ بزم اقبال، صفحہ ۱۳۔

۳۔ یہ خط اقبال کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل نہیں۔ اکبر کو یہ خط ۸ مارچ کو ملا (ملاحظہ ہو محولہ بالا مکتوب اکبر بنام خواجہ حسن نظامی) لاہور سے الٰہ آباد تک دو تین دن ڈاک میں لگ گئے ہوں گے اس لئے قیاس ہے کہ یہ خط ۵ یا چھ مارچ کو لکھا گیا۔

مہمان ہوتے تھے[1]۔ مجھ ہی سے ملنے آئے تھے۔ اس وقت میں اس قدر دل گرفتہ اور ضعیف نہ تھا۔ تاہم کچھ دلچسپی کی امید ہے۔ آپ ہوتے تو میری قائم مقامی کرتے۔ بندھا کو احکام دیتے۔ میں زیادہ حاضری بھی نہیں دے سکتا۔ ڈاکٹر صاحب سوشل طور پر ایک نعمت ہو گئے۔"[2]

لیکن یہ ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ اس دوران میں الٰہ آباد میں پلیگ کی وبا پھوٹ پڑی جس کا اظہار اکبر نے اپنے خط (بنام اقبال) میں کیا اور اقبال کے والد مکرم نے، جو اُن دنوں لاہور آئے ہوئے تھے، انہیں وہاں جانے سے روک دیا۔ اس امر کی اطلاع اقبال اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۱۸ء) بنام نیاز الدین خاں میں یوں دیتے ہیں:

"...... میں الٰہ آباد جانے والا تھا مگر مولانا اکبر کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں پلیگ زوروں پر ہے۔ والد مکرم نے، جو چند روز ہوئے یہاں تھے، یہ خط دیکھ کر مجھے الٰہ آباد جانے سے روک دیا۔"[3]

۱۔ اگر یہاں تین سال درست مانے جائیں تو اس لحاظ سے متذکرہ ملاقات تیسری ہوتی ہے جو ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور زیر بحث ملاقات چوتھی — جو قرین قیاس نہیں۔ قیاس غالب یہی ہے کہ یہاں ۱۹۱۲ء والی ملاقات کا ذکر ہوا ہے، کیونکہ محولہ بالا خط میں اکبر نے اپنے جس ضعف و دل گرفتگی کا اظہار کیا ہے اُس کا سلسلہ اُن کے کم سن فرزند ہاشم کی وفات (جون ۱۹۱۳ء) کے بعد شروع ہوا۔ اس واقعہ کے بعد اکبر کی صحت دن بدن انحطاط پذیر رہی جیسا کہ اُن کے بعض اشعار اور مکتوبات سے ظاہر ہے۔ لہٰذا مذکورہ خط میں اکبر کا یہ کہنا کہ "اس وقت میں اس قدر دل گرفتہ اور ضعیف نہ تھا" یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ملاقات ۱۹۱۲ء میں ہوئی اور دو دفعہ ہوئی۔ تین سال کا عرصہ غالباً یہاں تخمیناً لکھا گیا ہے جس میں کمی بیشی کا امکان ہے۔

۲۔ "خطوط اکبر" بنام خواجہ حسن نظامی، بار سوم، محبوب المطابع دہلی، صفحہ ۱۱۱۔

۳۔ "مکاتیب اقبال" بنام محمد نیاز الدین خان، صفحہ ۱۲۔

تاہم آرزو تے ملاقات بدستوُر رہی۔ چنانچہ اقبال اکبر کے نام اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۱۹) میں اپنی اس آرزو کا اظہار یوں کرتے ہیں :

"آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر یہ زمانہ گھر سے باہر نکلنے کا نہیں
اللہ تعالیٰ اس ملک کے لوگوں کی حالت پر رحم کرے :
مومن کو چاہیئے کہ خدا ہی کا ہو رہے !"[1]

یہ وہ زمانہ ہے جب پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد برِ عظیم پاک و ہند میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا اور اس کے خلاف انڈین نیشنل کانگرس نے ستیہ گرہ کی مہم شروع کی تھی ۔ ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا مشترکہ خوں بہا۔ اس سانحے کے بعد پنجاب میں مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا۔ اقبال کے محولہ بالا خط میں انہی الم انگیز حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں اکبر دہلی گئے اور خواجہ حسن نظامی کے حجرے "رین بسیرا" میں قیام کیا دسمبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں کانگرس اور مُسلم لیگ کے اجلاس بھی منعقد ہو رہے تھے۔ تقریبِ ملاقات کے لئے یہ بھی ایک اچھا موقع تھا۔ چنانچہ پروگرام بنا لیا گیا اور انتظار کی گھڑیاں گنی جانے لگیں۔ نیاز الدین خاں کے نام اقبال اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۹ نومبر ۱۹۱۹) میں لکھتے ہیں :

"۲۳ دسمبر کو دہلی جاؤں گا۔ وہاں سے ۲۵ یا ۲۶ کو واپس ہوتا ہوا ایک آدھ روز کے لئے آپ کی خدمت میں بھی ٹھہر جاؤں گا۔ بشرطیکہ صحت اچھی رہی۔ سردی کا سفر بہ سبب ضعف گردہ میرے لئے مضر ہوتا ہے۔ مولانا اکبر الٰہ آبادی دہلی

۱۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ۱۹۵۱، صفحہ ۷۶۔ "مومن کو چاہیئے ...." یہ مصرع اکبر الٰہ آبادی کے ایک شعر کا ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

جب آسمان اہلِ دغا ہی کا ہو رہے

ہیں اور آخر دسمبر تک قیام کریں گے۔ اُن کی زیارت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ فقیر سید نجم الدین صاحب کے لڑکے کی شادی ہے وہ اصرار کر رہے ہیں اگر مولانا اکبر کی کشش نہ ہوتی تو فقیر صاحب سے معافی مانگ لیتا۔“[۱]

اکبر دہلی سے عبدالماجد دریابادی کو اپنے مکتوب (مورخہ ۲۵ر نومبر ۱۹۱۹) میں اقبال کی آمد کی اطلاع یوں دیتے ہیں:

”۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اقبال صاحب، مرزا سلطان احمد صاحب وغیرہ نے لکھا ہے کہ ملنے آئیں گے۔ خدا جانے کب تک رہ سکوں گا۔“[۲]

شدت سرما کی آمد اور ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اکبر کا دہلی میں ماہ دسمبر تک قیام کچھ غیر یقینی سا ہو جاتا ہے اور ملاقات کی صورت بھی مخدوش نظر آنے لگتی ہے۔ اقبال اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۲۷ر نومبر ۱۹۱۹) میں اس تذبذب کا اظہار یوں کرتے ہیں:

”۔۔۔۔۔۔ مولانا اکبر کا خط مجھے دہلی سے آیا تھا۔ اگر وہ کچھ روز وہاں ٹھہرتے تو میں اُن کی زیارت کے لئے آجاتا۔“[۳]

پھر یہ تذبذب جلد ہی ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ اکبر دسمبر کے آغاز تک دہلی میں ہی مقیم رہتے ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام اقبال اپنے مکتوب (۱۵ر دسمبر ۱۹۱۹) میں لکھتے ہیں:

”سرکار والاتبار، تسلیم۔۔۔۔ مولانا اکبر آج کل دہلی کے حجرۂ رین بسیرا میں مقیم

۱۔ ”مکاتیب اقبال“ بنام نیاز الدین خاں، صفحہ ۲۵۔

۲۔ ”خطوط مشاہیر“ مرتبہ عبدالماجد دریابادی، صفحہ ۱۷۶۔

۳۔ ”اقبال نامہ“ حصہ اوّل، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، صفحہ ۴۲۶۔ یہ خط وحید احمد مدیر ”نقیب“ بدایوں کے نام ہے لیکن اقبال نامہ میں عشرت رحمانی کا نام ہے جو درست نہیں (بحوالہ انوار اقبال)

ہیں۔ انشاءاللہ ۲۲ دسمبر کو میں بھی اُن کی زیارت کے لئے دہلی جاؤں گا۔۔۔۔۔
دھوم دھام کے جلسے ہیں، یعنی کانگریس اور لیگ کا۔۔۔۔۔ ریلیشنز[1] کمیٹی
کی صدارت کے لئے مجھ سے کہا گیا تھا لیکن دُور رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ مولانا اکبر
کی کشش دہلی کھینچ رہی ہے۔

بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے "[2]

اکبر ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ تک دہلی میں ہی تھے۔ اس تاریخ کے ایک خط (بنام عزیز لکھنوی) میں اکبر لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔۔ سردی ایسی بڑھ گئی کہ سفر کی جرأت نہیں ہوتی۔ ۲۴ دسمبر کو اقبال صاحب آنے والے ہیں۔ زندگی باقی ہے۔ تو فروری میں قصد واپسی ہے"[3]

لیکن یہ ملاقات بھی نہ ہو سکی، کیونکہ اکبر کی طبیعت ناساز ہو گئی اور انہوں نے الہ آباد جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اقبال نیاز الدین خاں کو ۱۹ دسمبر ۱۹۱۹ کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مولانا اکبر تو غالباً ۲۳ سے پہلے ہی الہ آباد چلے جائیں گے، کیونکہ اُن کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ مَیں نے بھی اُن کی زحمت کے خیال سے زور نہیں دیا کہ وہ دہلی میں میری آمد تک قیام فرمائیں۔"[4]

اکبر ۲۳ دسمبر ۱۹۱۹ تک الہ آباد واپس پہنچ چکے تھے۔ اس تاریخ کے ایک خط میں عزیز لکھنوی کو لکھتے ہیں:

۱۔ غالباً کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ Relations Committee یا مجلس تعلقات مراد ہے۔

۲۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، صفحہ ۲۰۰۔

۳۔ "مکاتیب اکبر" بنام عزیز لکھنوی، صفحہ ۱۸۳۔

۴۔ "مکاتیب اقبال" بنام نیاز الدین خاں، صفحہ ۲۶۔

"مکرمی۔ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ سردی اور خوف اشتدادِ مرض لاحقہ سے گھبرا کر میں الٰہ آباد واپس آیا۔" ا؎

بہرکیف اس تشنہ کامی کے تقریباً دو ماہ بعد ۲۹ر فروری ۱۹۲۰ کو ملاقات کی ایک صورت نکل آئی جس میں اقبال تین دن تک اکبر کے مہمان رہے (اس ملاقات کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے)۔

نامہ و پیام

اکبر اور اقبال کے خطوط بھی ان دو شخصیتوں کی رُوحانی ملاقات کا اہم ذریعہ تھے۔ اقبال کے لئے اکبر کے مکتوبات ایک روحانی کیف و سرور کا باعث ہوتے تھے۔ بقول اُن کے "تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں"۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مشرق کے ان دو عظیم فنکاروں کی یہ قلمی ملاقات کتنی نتیجہ خیز اور یہ سلسلۂ نامہ و پیام کتنا دلچسپ ہوگا۔ افسوس ہے کہ یہ سارے مکتوبات اس وقت دستیاب نہیں ہو سکے، ورنہ ایک پوری داستانِ ذوق و شوق مرتب ہو سکتی تھی۔ اقبال کے کچھ خطوط (بنام اکبر) تو محفوظ کر لئے گئے ہیں، لیکن اکبر کے خطوط (بنام اقبال) غالباً زمانے کی دست بُرد کا شکار ہو گئے یا شاید کسی گوشے میں پڑے ہوں۔ اگر یہ خطوط منظرِ عام پر لائے گئے تو یہ ایک علمی، ادبی اور قومی خدمت ہوگی۔ (راقم کو صرف دو خطوط مل سکے جو اِس کتاب میں شامل ہیں)

بہرکیف نامہ و پیام کے اس تشنہ سلسلے کے ذریعے اکبر اور اقبال کے باہمی روابط پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ سلسلہ بھی ان دو شخصیتوں کے فکری زاویوں کو ملاتا ہوا نظر آتے گا۔

ا۔ "حیاتِ اکبر" ترتیب عشرت حسین، تسوید مُلّا واحدی، صفحہ ۱۲۹

اکبر کے ظریفانہ رنگ کی مُلک میں دھوم تھی۔ انہوں نے ظرافت کا یہ اسلوب بطور پردۂ سُخن اختیار کیا تھا اور اس طرح اپنے ہم وطنوں کو ہنسا ہنسا کر رُلایا تھا۔ اگرچہ اکبر کے اس رنگ خاص کا تتبعّ امر محال تھا تاہم بعض شعراؔ نے اکبر کے ظریفانہ اسلوب سے متاثر ہو کر اپنے کلام میں اسے برتنے کی کوشش کی۔ اقبال بھی ان شعراؔ میں سے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی اُن کے اُردو مجموعۂ کلام "بانگِ درا" میں اس رنگ کا کچھ ظریفانہ کلام موجود ہے (اور اس قسم کا کچھ کلام انہوں نے "بانگِ درا" مرتب کرتے وقت خارج کر دیا جو اَب "باقیاتِ اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد اور "سرودِ رفتہ" مرتّبہ مولانا غلام رسول مہر میں شامل ہے)۔ غالباً بعض حضرات کو اقبال کی یہ ادا پسند نہ آئی اور انہوں نے خواہ مخواہ اکبر اور اقبالؒ کا موازنہ شروع کر دیا۔ ان حضرات کی یہ بدمذاقی اکبر کو بھی ناگوار گذری۔ اُنہوں نے اس روش کی مذمّت کرتے ہُوئے اقبال کی دلجوئی ضروری سمجھی اور اس سلسلے میں اُنہیں ایک خط بھی لکھا (اگر یہ خط موجود ہوتا تو اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالتا)[۱] اقبال نے اکبر کے نام اپنے مکتوب (۱۶ر جولائی ۱۹۱۴ء) میں اس خط کی رسید کے ساتھ ساتھ اس بارے میں اپنے احساس و تاثر کا اظہار بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"مخدوم مکرّم قبلہ مولانا، السلام علیکم   آپ کا نوازش نامہ ابھی مِلا جس کو پڑھ کر بہت مسرّت ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو اپنا پیرو مرشد تصوّر کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمّت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب

۱۔ غالباً "نقاد" آگرہ میں یہ بحث چھیڑی گئی تھی۔ اکبر نے مدیر نقاد کو خط لکھ کر اقبال کو بھی اس سے آگاہ کیا تھا۔

آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاءاللہ جب تک میں زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا، کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصول دولت و جاہ نہیں، محض اظہار عقیدت ہے۔ عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو اس کے رنگ میں شعر لکھے، یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اسی خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں، مگر عوام کے رجحان و بد مذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا، اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کرلئے۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے"۔ ۱۔

اکبر کے مکتوبات اقبال کے ندیم تنہائی ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ ان کی فکر و نظر کے لئے مہمیز کا کام بھی دیتے تھے۔ اقبال مکتوبات اکبر کو اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی سرمۂ بصیرت اور ایک بیش قیمت متاع تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مکتوب (۱۸، اکتوبر ۱۹۱۵) میں لکھتے ہیں۔

"آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے۔ اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے"۔

پھر اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

۱۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم، صفحہ ۴۰، ۴۱۔

" مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے [۱]۔ یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کے لئے یہی خیال محرک ہوا [۲] میں گزشتہ دس سال سے اسی پیچ و تاب میں ہوں۔" [۳]

اکبر کا کلام معجز رقم بھی اقبال کے لئے محرک فکر (Inspiration) کا کام دیتا تھا۔ حقائق و معارف کو چند سیدھے سادے الفاظ کا خوش نما جامہ پہنا دینا اکبر کا کمال فن تھا جس سے اقبال بڑے متاثر تھے۔ ۱۹۱۸ کے اواخر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر ہیگ انتقال کر گئے اور اقبال کو ان کی جگہ کچھ عرصے کے لئے تدریسی فرائض انجام دینے پڑے۔ وہ اپنے مکان پر ایم۔اے (فلسفہ) کے طلبہ کو درس دیتے اور اس ضمن میں انہیں اکبر کے اشعار بھی سناتے۔ اکبر کے نام ایک خط (۲۸ نومبر ۱۹۱۸) میں اقبال لکھتے ہیں۔

" لیکچر کیا ہیں، انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عرف عام میں تاریخ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی میں ان طلبہ کو آپ کا یہ شعر سنا رہا تھا۔

ع میں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تُل کر نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کے

سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ!

بہر حال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔

جان حاضر ہے مگر راہ خدا ملتی نہیں [۴]

میں آپ کا مقصود خوب سمجھتا ہوں۔ سیدھے سادے الفاظ میں حقائق بیان کر دینا

۱۔ یہاں اکبر کا مندرجہ ذیل شعر اقبال کے پیش نظر ہے جو غالباً انہوں نے کسی خط میں تحریر کیا ہوگا۔

نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت   تو وہ کیا ہے؟ فقط اِک فلسفہ ہے

۲۔ مثنوی " اسرار خودی"   ۳۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم، صفحہ ۴۴، ۴۰

۴۔ اس شعر کا پہلا مصرع یہ ہے، جوشش خاطر کو سبیل حق نما ملتی نہیں

آپ کا خاص حصہ ہے ۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔ آپ کی رباعی

اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے ۱ ۔

بہت عرصہ سے میں نے نوٹ کر رکھی ہے ''۲ ۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ جب دو صاحب فن شخصیتوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوتا ہے تو علی العموم وہ اپنی اپنی تخلیقات کو ایک دوسرے کی نظر سے گذار کر داد کے خواہاں ہوتے ہیں ۔ کسی صاحب سخن کو کوئی شناس مل جائے تو اس کی خوش بختی کے کیا ہی کہنے ۔ گویا اس کی روحانی محنت و ریاضت کا صلہ اسے مل گیا ۔ اکبر اور اقبال بھی ایک دوسرے کے کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ اکبر کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے مکتوبات میں (خصوصاً اگر مکتوب الیہ صاحب سخن یا سخن شناس ہوتا، تو) اپنے اشعار لکھا کرتے تھے ۔ چنانچہ اقبال کے نام خطوط میں بھی یہ سلسلہ جاری تھا ۔ اسی طرح اقبال بھی اپنے مکتوبات میں اپنا تازہ کلام اکبر کے ملاحظے کے لئے پیش کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مثنویات "اسرار خودی" و "رموز بے خودی" کے جستہ جستہ اشعار اپنے خطوط (بنام اکبر) میں لکھے ہیں ۔ اس طرح دونوں صاحبان سخن ایک دوسرے کے فکر و فن کی قدر شناسی کا حق نامہ و پیام کے ذریعے ادا کرتے رہتے تھے ۔ اکبر کے نام اقبال نے اپنے ایک مکتوب (۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء) میں اکبر کے ایک شعر کے بارے میں (جو غالباً اکبر نے اپنے کسی خط میں تحریر کیا ہوگا کیونکہ اس وقت تک اکبر کا جو کلام چھپا تھا اس میں یہ شعر درج نہیں تھا ۔ یہ شعر "کلیات اکبر حصہ سوم" میں شامل ہے ۔) اپنے تاثرات یوں قلم بند کئے ہیں :

---

۱ ۔ یہ رباعی نہیں بلکہ قطعہ ہے ۔ پورا قطعہ درج ذیل ہے ۔

ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم — لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے

کھلتا نہیں راز دہر شکوہ ہے تو یہ ہے — اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

۲ ۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم ، صفحہ ۴۷ ۔

"مخدومی " السلام علیکم ـــــ کل خط لکھ چکا ہوں. مگر آپ کے اس شعر کی داد دینا بھول گیا :

جہاں ہستی ہوئی محــــدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصــــر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ! کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے. ہیگل جس کو جرمنی والے افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے ہیں اور تخیل کے اعتبار سے حقیقت میں ہے بھی افلاطون سے بڑا، اس کا تمام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے. آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا، یا یوں کہئے کہ ہیگل کا سمندر اس قطرے کی تفسیر ہے.

ہیگل لکھتا ہے کہ اصول تناقض ہستیٔ محدود کی زندگی کا راز ہے اور ہستیٔ مطلق کی زندگی میں تمام قسم کے تناقض، جو ہستیٔ محدود کا خاصہ ہیں، گداختہ ہو کر آپس میں گھل مل جاتے ہیں.

کیمبرج کی تاریخ ہندوستان کے لئے جو مضمون اردو لٹریچر پر مجھے لکھنا ہے اس میں اس شعر کا ضرور ذکر کروں گا. اسی رنگ کے فلسفیانہ اشعار اور بھی لکھیے کہ خود بھی لذت اٹھاؤں اور اوروں کو بھی اس لذت میں شریک کروں "۔ ۱

جب ایک صاحب سخن دوسرے سخن ور کو یوں داد تحسین دے اور اس کی فکری قدر و منزلت کو متعین کرے تو اس سخن ور کا اس سے متاثر ہونا فطری امر ہے. چنانچہ کلیات سوم میں اکبر نے اس شعر کے ساتھ حاشیہ میں یہ لکھا ہے :

---

۱ - " اقبال نامہ " حصہ دوم ، صفحہ ۴۲ - ۴۳ - ۴۴. کیمبرج کی تاریخ ہندوستان کے لئے اقبال نے محولہ بالا مضمون نہیں لکھا تھا. تاہم انہوں نے اکبر کے اس شعر پر اپنے خیالات کا اظہار stray Thoughts کے عنوان سے نیوایرا (لکھنؤ) میں کیا تھا. (دیکھئے ضمیمہ الف)

" اس شعر پر ڈاکٹر اقبال صاحب نے انگریزی میں ایک آرٹیکل لکھا ہے اور فلاسفر ہیگل پر اس طرزِ بیان میں مصنف کو ترجیح دی ہے۔"[1]

اقبال کلامِ اکبر کی باریکیوں اور اکبر کے فکر و فن سے بخوبی آگاہ تھے اور اس سلسلے میں محولہ بالا آرٹیکل لکھنے کے علاوہ بھی وہ اپنے تاثرات کا اظہار کسی مضمون کی شکل میں کرنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ اکبر کے نام ایک خط (۲۸، اکتوبر ۱۹۱۸ء) میں یہ لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔ "زمانہ" میں ریویو دیکھا تھا[2]، خیر اچھا ریویو تھا مگر آپ کی شاعری پر ریویو لکھنے کا حق آج تک کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکا۔ "زمانہ" نے جو اشعار انتخاب کئے وہ دو چار روز ہوئے بار بار وجد میں مزے لے لے کر پڑھے گئے۔ وقت کی مصلحت نہیں ورنہ آپ کے اشعار پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا اور زندگی رہی تو انشاء اللہ کچھ ضرور لکھوں گا[3]"

اقبال کی یہ خواہش تو غالباً عزائم کی فہرست ہی میں رہی۔ البتہ محولہ بالا شعر کے بارے میں انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار "نیو ایرا" میں کیا (۱۸، اگست ۱۹۱۷ء)، یہ مختصر انگریزی مضمون اس تالیف کے آخر میں ضمیمہ الف کے طور پر شامل ہے۔

اکبر کے خطوط (بنام اقبال) کی عدم موجودگی میں نامہ و پیام کا یہ سلسلہ کچھ ادھورا سا رہ جاتا ہے تاہم اکبر کے بعض خطوط سے (جو دوسرے حضرات کے نام ہیں)، اقبال کے بارے میں ان کے تاثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ یہ تاثرات اس لحاظ سے

۱۔ "کلیاتِ اکبر" حصہ سوم، مطبوعہ اسرار کریمی پریس، الہ آباد، بار پنجم ۱۹۴۰، صفحہ ۵۱۔

۲۔ پنڈت دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" نے "اردو شاعری اور شعرائے حال" کے عنوان سے ایک مضمون میں اکبر اور اقبال کے کلام پر تبصرہ کیا تھا۔ یہ مضمون پہلے کانپور میں "قومی ہفتہ" کی تقریب کے سلسلے میں پڑھا گیا۔ اس کے بعد "زمانہ" کی اشاعت اکتوبر و نومبر ۱۹۱۸ء میں یہ مضمون بالاقساط چھپا۔ پہلی قسط میں اکبر کی شاعری پر ریویو تھا، دوسری قسط میں اقبال کی شاعری پر۔

۳۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم، صفحہ ۷۱-۷۲۔

زیادہ اہم ہیں کہ ان میں غائبانہ شہادت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ تصوّف کی بحث کے سلسلے میں اکبر کے چند خطوط کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا ہے تاہم یہ نظریاتی اختلاف چونکہ نیک نیتی پر مبنی تھا اس لئے یہ تلخی مروّت و محبت کے جذبے پر غالب نہ آسکی اور بالآخر فتح محبت ہی کی ہوئی۔

خواجہ حسن نظامی نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں شرکت کے بعد اکبر کو خط لکھا جس میں اقبال کے مذہب سے والہانہ لگاؤ اور اطاعت و عبادت گزاری کا بھی ذکر کیا۔ اکبر اس سے بہت خوش ہوئے اور اس خط کے جواب میں ''۲۹ فروری ۱۹۱۲ کے خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھا:

"حضرت اقبال کی مشغولی فی الطاعۃ سے نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے۔

چو مجنوں سر بر آورد از تہ خاک — ندا آمد بدو از ایزد پاک
کہ اے مجنوں چہ آوردی بدرگاہ — بر آمد از دل مجنوں یکے آہ
کہ چنداں شور لیلا در سرم بود — کجا پروائے روز محشرم بود

جب لیلیٰ کے تصوّر میں یہ محویت تھی تو لیلیٰ آفرین کی محبت میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ان کو مبارک باد دیکھوں گا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں وہ مجھے اصرار و شوق سے مدعو کرتے ہیں۔ میری اسیری و معذوری کے حالات سے وہ آگاہ نہیں ہیں۔ خدا مسبب الاسباب ہے شاید نجات پا جاؤں۔"[۱]

مرزا سلطان احمد نے اپنی ایک کتاب ڈاکٹر اقبال کے نام معنون کی۔ اکبر نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے نام اپنے ایک خط رقم ۲ دسمبر ۱۹۱۲، میں یہ لکھا:

۱۔ "خطوط اکبر" بنام خواجہ حسن نظامی صفحہ ۹۔ اکبر نے اقبال کے نام ۳ مارچ ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھا تھا۔ "حسن نظامی کی تحریر سے آپ کی مشغولی طاعت و قرآن خوانی کا ذکر دریافت کر کے خوش ہوا۔" نیز اس خط میں جلسۂ انجمن حمایت اسلام میں شرکت سے اپنی معذوری کا اظہار کیا تھا۔

"..... میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے مکرمی ڈاکٹر اقبال کے نام اس کتاب کو معنون کیا۔ حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے اور کیا طرز ادا، کیا بلاغت ہے۔ مغربی لٹریچر کی تکمیل، اس پر یہ رنگ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی صدقے ہو، ان کا یہ مصرع یعنی ع: "در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند"

میں کبھی نہیں بھولتا۔

میں ان کی طرف سے بھی سپاس گذاری کرتا ہوں۔ اگرچہ اب تک مجھ کو ان سے بھی ملنے کی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ عجیب قید میں ہوں۔ اس موسم میں ناتوانی اجازت سفر نہیں دیتی۔ یہاں سردی تیز ہے۔ ہاشم کے اسکول میں مئی میں تعطیل ہوتی ہے۔ اس وقت گرمی کی شدت ہوتی ہے۔ دیکھئے کب زیارت کا موقع ملتا ہے۔ بہر کیف اس مطلع سے تسکین ہو جاتی ہے۔

آرزو دنیا میں کب نکلی اولوالابصار کی
چشم موسٰی کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی [۱]

مرزا سلطان احمد نے پرچہ "اقبال" لدھیانہ میں اقبال کی شاعری پر ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انہوں نے اکبر و اقبال کے ذہنی فاصلوں اور فکری مماثلتوں کا بھی جائزہ لیا۔ اکبر نے یہ مضمون پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار ایک قطعے کی شکل میں کیا اور یہ قطعہ "اقبال" لدھیانہ میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ اسی اثنا میں مرزا سلطان احمد کا ایک خط انہیں موصول ہوا جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

"الہ آباد ۲۰ جنوری ۱۹۱۴ء۔

حبیبی و مکرمی، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ دل کو دل سے راہ ہے۔ میں نے سنا کہ آپ ریاست بہاول پور میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اقبال صاحب سے آپ کا ایڈریس دریافت کیا گیا تھا۔ ہنوز جواب نہیں آیا۔ لیکن پرچہ "اقبال" لدھیانہ میں آپ کا مضمون تحت عنوان "اقبال"

۱۔ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد صفحہ ۴۷-۴۸۔

نظر آیا۔ دل چاہا کہ اس کی مدح سرائی کروں۔ لیکن یہ خیال اس پیرائے میں ظاہر ہوا۔

خوب ہے موعظت حضرت سلطان احمد

دل انسان کی چمک خوب کہ سونا بہتر

غفلت و کبر سے غم خانۂ اکبر اچھا

خندۂ جام سے اقبال کا رونا بہتر

ظلم ہے ان کو اگر داد نہ دوں میں لیکن

اپنے مدّاح کا مدّاح نہ ہوتا بہتر

چونکہ آپ نے اکبر و اقبال کا ذکر خیر اپنے مضمون میں کیا تھا اس بنا پر یہ اشعار موزوں ہو گئے۔ میں نے دفتر "اقبال" لدھیانہ کو بھیج دیئے۔ آج آپ کا الطاف نامہ پہنچا۔ جناب والا! اگر مجھ میں یا حضرت اقبال میں کچھ ہے تو آپ ہی کے دل کی زبان ہے . . . ."۱

مرزا سلطان احمد کے ایک دوسرے مضمون "گل و بلبل" مطبوعہ "خطیب" کے بارے میں اکبر اپنے تاثرات کا اظہار ان کے نام اپنے مکتوب (۷ ستمبر ۱۹۱۵ء) میں یوں کرتے ہیں۔

". . . گل و بلبل کا مضمون "خطیب" میں آپ نے خوب لکھا ہے۔ میں اقبال دونوں آپ کے مدّاح و شکر گزار ہیں۔ وہ مضمون صرف لطیفہ نہیں ہے بلکہ نہایت معنی خیز ہے، صورت سے معنی اور مجاز سے حقیقت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جزاک اللہ"۲

اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" کی اشاعت کے بعد تصوّف کے مسائل کی بحث چھڑ جاتی ہے اور سلسلۂ نامہ و پیام کا رُخ بھی ادھر ہو جاتا ہے (جس کا تذکرہ آگے آئے گا)، معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں خط و کتابت کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے کچھ منقطع سا ہو گیا تھا۔ "اقبال نامہ" کے مجموعہ مکاتیب میں سال ۱۹۱۸ء کے مکتوبات اقبال

۱۔ "مکتوبات اکبر" بنام مرزا سلطان احمد، صفحہ ۵۵-۵۶۔
۲۔ ایضاً صفحہ ۴۴

بنام اکبر، کی تعداد سات ہے جن میں زیادہ تر مسئلہ تصوف ہی زیر بحث ہے ۔ سال ۱۹۱۹ء کا صرف ایک خط ہے جو ۲۰ اپریل کو لکھا گیا اور جس کے لفافے پر سنسر شپ کی سلپ لگی ہوئی ہے ۔ ۱ اس کے بعد یہ سلسلہ ' اقبال نامہ ' کی حد تک ختم ہو جاتا ہے ۔ لیکن اکبر اور اقبال کے درمیان گاہے گاہے خط و کتابت اس کے بعد بھی ہوتی رہی ہے اور کم از کم ایک بار تو ملاقات بھی ہوئی ۔ تاہم اکبر کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے خاموشی سی رہی ۔

اکبر کو اپنے آخری ایام میں اقبال کے سکوت کا بڑا احساس تھا چنانچہ مرزا سلطان احمد اور شیخ سر عبدالقادر کے نام مکتوبات میں انہوں نے اپنے اس احساس کا اظہار بھی کیا ہے ۔

مرزا سلطان احمد کو ۲۹ ستمبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" . . . معلوم نہیں حضرت اقبال آج کل کہاں اور کس سوچ میں ہیں ۔ میں بالفعل پرتاب گڑھ میں ہوں جہاں میاں عشرت ہیں " ۲

شیخ عبدالقادر کے نام ۳۱ مارچ ۱۹۲۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :

" . . . . یہ تو فرمائیے ڈاکٹر اقبال صاحب کیا کر رہے ہیں ۔ عرصے سے خط نہیں آیا " ۳

چند روز کے بعد اکبر نے شیخ عبدالقادر کو ایک اور خط لکھا ۔ اس زمانے میں ڈاکٹر نکلسن نے انگلستان میں اقبال کی مثنوی " اسرار خودی " کا انگریزی ترجمہ کر کے چھپوایا تھا ۔ یہ گویا اقبال کی فکری اہمیت کا پہلا اعتراف تھا جو مغرب کے ایک فاضل نے کیا ۔ مغرب کی قبولیت کی یہ سند مشرق کے بعض محکوموں کے لئے جو ہر اس بات کے قائل ہوتے تھے جسے مغرب پسند کرے ، ایک سند جواز کی حیثیت بن گئی ۔ اکبر کو یہ ادا پسند نہ تھی کہ ہم اپنے فنکاروں کی عظمت فکر کو صرف اسی وقت قبول کریں جب مغرب میں ان کا اعتراف ہو ۔ مذکورہ ذیل خط میں اکبر نے اپنے اسی احساس کو بڑے بلیغ انداز میں ظاہر کیا ہے ۔

---

۱ ۔ اس زمانے میں پنجاب میں مارشل لا نافذ تھا ۔
۲ ۔ مکتوبات اکبر ۔ بنام مرزا سلطان احمد صفحہ ۱۱۷ ۔
۳ ۔ رقعات اکبر ۔ مرتبہ شیخ ہمایوں نصیر ، صفحہ ۱۲۸ ۔

٠ الہ آباد ۱۲، اپریل ۱۹۲۱ء۔

میرے مکرم ، اللہ آپ کو خوش رکھے ! آپ نے رباعیات کی نسبت کچھ نہ لکھا ضلع اناؤ کے ہیڈ مولوی صاحب خواہاں تھے ۔ میں نے لکھ دیا کہ شیخ عبدالقادر صاحب ان کی تدوین کر رہے ہیں ۔ مجھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی انگلستان میں پسند ہوئی ۔ مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا ۔

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی او سلے

میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں ۔

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی واہ کا

لیکن وہ بھی کیا کریں ، مجبور ہیں ۔ میں تو زندگی ختم کر چکا ۔ اور ہمیشہ اُدھر سے بے نیاز رہا ۔ وہ تعلیم ہی نہیں ہے ۔ میں نے تو ان دو چار لفظوں میں اپنا مطلب ادا کر دیا ہے ۔

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
حسن بے حد ہے خودی محدود ہے

میرا مطلع پیش نظر رکھیے ۔

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے ۱

آپ اس کے اول داد دینے والے تھے ۔ خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے اور باہم ہمدردی عطا فرمائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کا قدیم نیاز مند ۔ اکبر" ۲

غالباً اکبر کا یہ آخری خط ہے جس میں انہوں نے اقبال کا تذکرہ کیا ہے ۔ اس کے چند ماہ بعد ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ، اکبر اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے ۔

---

۱ ۔ اس مطلع کا دوسرا مصرع یہ ہے :
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

۲ ۔ رقعات اکبر ۔ مرتبہ شیخ ہمایوں نصیر ، صفحہ ۱۳۰ ۔ ۱۳۱ ۔

ذکرِ منظوم

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنے مقالہ "اکبر و اقبال" مطبوعہ "علی گڑھ میگزین" میں رقم طراز ہیں کہ اکبر نے اپنے ہم عصروں سے بعض کی طرف اپنے کلام میں اشارے بھی کئے ہیں لیکن اس میں اقبال کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔[1] فاضل مقالہ نگار کا یہ خیال ہے کہ اکبر نے اس کی تلافی اپنے اکثر و بیشتر خطوط میں علی الخصوص جو خواجہ حسن نظامی کے نام لکھے گئے کر دی ہے۔ ہماری رائے میں اکبر نے مکتوبات کے علاوہ اپنے کلام میں بھی کئی جگہ اقبال کا ذکر کیا ہے اور یہ ذکرِ منظوم بھی اشاروں کنایوں میں نہیں بلکہ صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اقبال نے بھی کچھ اشعار ذکرِ اکبر کے سلسلے میں کہے ہیں۔ ان دونوں فنکاروں کا یہ باہمی ذکرِ منظوم بھی خاصہ دلچسپ اور معلومات افزا سلسلہ ہے۔

قبل ازیں نامہ و پیام کے سلسلے میں اکبر کا ایک قطعہ پیش کیا جا چکا ہے جو انہوں نے مرزا سلطان احمد کے نام ایک خط میں تحریر کرنے کے علاوہ "اقبال" لدھیانہ میں چھپنے کے لئے بھی ارسال کیا تھا۔ اس قطعے میں اکبر نے اپنی اور اقبال کی شاعری کے بارے میں کچھ اشارے بھی کئے ہیں۔ اقبال کی والدہ مرحومہ کے انتقال پُرملال پر اکبر نے تاریخ کہی۔ ایک فارسی قطعہ کی صورت میں اور دوسری اردو نظم میں۔ اقبال نے اپنی والدہ ماجدہ کی لوحِ مزار پر سید اکبر الہ آبادی کا کہا ہوا یہ فارسی قطعہ ثبت کرا دیا تھا۔[2]

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت	سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُر درد و غم	رحلت مخدومہ تاریخِ وفات

(۱۳۳۲ھ)

دوسری تاریخ میں مادۂ تاریخ کے علاوہ اقبال کے اوصاف و محاسنِ اخلاق بھی بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ "علی گڑھ میگزین" اکبر نمبر (۱۹۵۰) صفحہ ۸۶۔

۲۔ بحوالہ "سرودِ رفتہ" مرتبہ غلام رسول مہر، صفحہ ۲۱۵۔

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظر میں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوق معرفت
یہ طریق راستی خودداری بے تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے اہل دل تھے صاحب اسرار تھے
جلوہ گران میں اُنہیں کا ہے یہ فیض تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبع عالی منزلت
مادر مخدومہ اقبال جنت کو گئیں
چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہگیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمت عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریک حضرت اقبال ہے
سال رحلت کا بیان منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات
"رحلت مخدومہ" سے پیدا ہے تاریخ وفات

"اسرار خودی" کی اشاعت کے بعد جب تصوّف کی بحث چھڑی تو اس معرکۂ تقریر و تحریر میں ایک طرف اقبال اور ان کے کچھ ساتھی تھے[۱] اور دوسری طرف خواجہ حسن نظامیؒ ان کے حواری اور اہل طریقت کا گروہ تھا۔ اقبال اور حسن نظامی میں دیرینہ راہ و رسم تھی۔ لیکن اس بحث و تکرار نے کچھ ایسی تلخ اور ناخوشگوار صورت اختیار کرلی کہ دیرینہ تعلقات کا رشتہ شکستہ و پامال ہوتا نظر آنے لگا۔ اکبر کی طبیعت کو تصوف سے لگاؤ تھا لیکن اس بے نتیجہ

۱۔ اقبال نے "ستارۂ صبح" میں ظفر علی خاں کی قلمی یلغار سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔

بحث وتکرار کو وہ دل سے ناپسند کرتے تھے۔ اقبال اور حسن نظامی کے اس معرکۂ گفتار کو درجۂ اعتدال پر لاکر اکبر نے ان دونوں حضرات کے درمیان مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس سلسلے میں مکتوبات کے علاوہ انہوں نے کچھ اشعار بھی کہے ہیں۔ حسن نظامی کے نام ایک خط (۱۰ جنوری ۱۹۱۶ء) میں ذیل کے چار اشعار لکھے ہیں اور کہا ہے کہ "آپ کو عذر نہ ہو تو ہم کو عذر نہیں کہ یہ اشعار شائع ہوں۔ ثقالت نہیں ہے" ۱

حضرت اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی ان میں، ان میں بانکپن

آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لئے — جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے

ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی

"ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص"

غالباً یہ اشعار شائع ہوئے اور اقبال نے ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

(ملاحظہ ہو اقبال کا خط مورخہ ۴ فروری ۱۹۱۶ بنام لسان العصر) مرزا سلطان احمد کے نام اکبر اپنے ایک مکتوب (۲۵ جنوری ۱۹۱۶) میں لکھتے ہیں۔

"خواجہ حسن نظامی صاحب کو میں نے بار بار یہی لکھا کہ حضرت اقبال کی مثنوی کی مخالفت پر قلم نہ اٹھائیں۔ حضرت اقبال کو بھی میں نے نہ چاہا کہ بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسب فلسفہ کا دُرّہ اٹھائیں ۲۔ اس کے بعد اسی خط میں ذیل کے اشعار لکھے ہیں جن میں بقول ان کے "ڈاکٹر اقبال صاحب، صوفی صاحب، حافظ شیراز صاحب سب کی حمایت ہے":

نہ بسط دیکھتے ہیں اور نہ قبض دیکھتے ہیں
وہ ڈاکٹر ہیں زمانے کی نبض دیکھتے ہیں

دفا کا رنگ بدل جائے ہے یہ ان سے بعید
فقط موافق موسم لکھی ہے اک تمہید

۱۔ "خطوط اکبر" بنام خواجہ حسن نظامی صفحہ ۲۴۔
۲۔ "مکتوبات اکبر" بنام مرزا سلطان احمد صفحہ ۶۸۔

عمل کا رُخ نہیں قوت فزا، مرض یہ ہے
کیا ہے نسخہ جو تحریر، بس غرض یہ ہے
جہاں میں قوّت بازو دکھائیے اس وقت
مراقبے سے ذرا سر اٹھائیے اس وقت
اُٹھاؤ ان پہ نہ ہرگز تم اعتراض کا ہاتھ
یہی کہو کہ بہت خوب ہم ہیں آپ کے ساتھ
دکھائیے تو خدارا خودی کے جوبن کو
مراقبہ بھی اٹھا دے گا اپنی گردن کو
شرابِ حضرتِ حافظ سے کچھ نہیں نقصان
زمارچ تا بہ مئی اس کا ہے فقط سامان
بس ایک رُبع ہے کافی برائے مستی و حال
بقیہ سال ہے نذر طریق سعی و جدال
وہ خود ہی کہہ گئے ہیں یہ بپاسِ فکر معاش
سہ ماہ مے خورد نُہ ماہ پارسامی باش

بحث و تکرار کی گرم بازاری میں جب کوئی ایسی بات پیدا ہوتی جس سے فریقین ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور باہمی افہام وتفہیم سے متنازع فیہ مسائل کا کوئی حل تلاش کریں تو اکبر کو بڑی خوشی ہوتی۔

ایسے ہی ایک موقعہ پر اکبر نے خواجہ حسن نظامی کو ایک خط لکھا اور اس خط (۹، اگست ۱۹۱۶ء) میں چند اشعار بھی لکھے جن میں اقبال اور حسن نظامی دونوں کے افکار و کردار کا دلچسپ موازنہ کرتے ہوئے انہیں ایک دوسرے کی قدر کرنے کا مشورہ دیا۔

"... میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔

میں نے ان کا خط دیکھ کر آپ کو مخاطب کر کے چند شعر کہے ۔

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد
قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر
ہیں دشمن فتنۂ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لئے جنوں ہے تم کو اگر
دیوؤں کے لئے بنے سلیماں وہ بھی " ۱

یہ تو تھے اکبر کے وہ اشعار جو انہوں نے اقبال کے بارے میں رقم کئے ۔ اقبال نے بھی کچھ اشعار ذکر اکبر کے سلسلے میں کہے ہیں ۔ ایک فارسی مرثیہ جو اکبر کی وفات پر لکھا گیا اور کم از کم دو شعر اور مل جاتے ہیں ۔ ایک شعر اقبال کے ایک مکتوب بنام نیاز الدین خاں (۲۷ جون ۱۹۱۷ء) میں سے ۲ ملتے ہیں ۔

" ۔ ۔ ۔ ہاں آموں پر ایک لطیفہ یاد آ گیا ۔ گزشتہ سال مولانا اکبر نے مجھے لنگڑا آم بھیجا تھا ، میں نے پارسل کی رسید اس طرح لکھی ہے :۔

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا ! "

دوسرا شعر اکبر کے ظریفانہ اسلوب کی ندرت کے بارے میں ہے جسے اقبال نے اکبر کی وفات کے بعد کسی وقت ایک ظریفانہ قطعے کے ضمن میں کہا ہے اور اس طرح اکبر مرحوم کے رنگ سخن کی داد دی ہے ۔ ملاحظہ ہو ۳

---

۱ ۔ " خطوط اکبر " بنام خواجہ حسن نظامی صفحہ ۴۰ ۔
۲ ۔ " مکاتیب اقبال " نیاز الدین خان صفحہ ۹ ۔
۳ ۔ بحوالہ " باقیات اقبال " مرتبہ سید عبدالواحد ، صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۵ ۔

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ
دل گراں، ہمت سبک، ووٹ فزوں، روزی تنگ

بے ٹکٹ، بے پاس، بھارت کی سیاسی ریل میں
ہو گیا آخر مسیتا بھی بمع اسباب مگ

"لک وون" کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو
اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے "مسلم آؤٹ لک"۔

کیا عجب پہلے ہی لیڈر ہیں یہ کر دے آشکار
کس طرح آیا کوے کر اُڑ گیا صاحب کا مگ

ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگ سخن
ہر سخنور کی یہاں طبع رواں جاتی ہے رُک

قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں
کر دیا متروک دلّی کے زُباں دانوں نے ٹھگ

اکبر کی وفات پر اقبال نے جو مرثیہ کہا ہے اس سے جہاں اکبر کی فکری و فنی قدر و منزلت کا تعین ہوتا ہے وہاں اکبر اور اقبال کے ملّی احساسات اور زاویہ ہائے فکر و نظر کی یک جہتی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ یہ مرثیہ فارسی میں ہے اور اقبال کے فارسی مجموعۂ کلام "پیام مشرق" کے پہلے ایڈیشن (۱۹۲۳ء) میں شامل تھا، مگر بعد کے ایڈیشنوں سے اسے حذف کر دیا گیا جس کی وجہ بقول مؤلف "باقیات اقبال" یہ ہو سکتی ہے کہ "پیام مشرق" میں علامہ کے پیش نظر زیادہ تر وہ مسائل تھے جن کا تعلق اقوام اور ملل کی موت اور زندگی سے تھا اور مرثیہ کی نوعیت ایک دوست کا نوحہ ہونے کی حیثیت سے صرف شخصی اور ذاتی تھی"۔ مرثیہ درج ذیل ہے۔

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر — حیاتش بحق بود روشن دلیلے
سر ذروۂ طور معنی کلیمے — بہ بت خانۂ دور حاضر خلیلے

نوائے سحرگاہ او کارواں را — اذان درائے پیام رحیلے
زدلہا برافگندۂ لات و عزیٰ — زجانہا کشائندۂ سلسبیلے
دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی — دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

ایک ناخوشگوار معارضہ

اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" پہلی دفعہ ۱۹۱۵ کے وسط میں شائع ہوئی۔ فروری ۱۹۱۵ تک یہ مثنوی تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ اور اس کا عنوان زیرِ غور تھا۔ چنانچہ اقبال اپنے ایک مکتوب (۶ فروری ۱۹۱۵) بنام خواجہ حسن نظامی میں لکھتے ہیں:

"ڈیئر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے اب تقریباً تیار ہے اور پریس جانے کو ہے اس کے لئے بھی کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام اسرارِ حیات، پیامِ سروش، پیامِ نو، آئینِ نو تجویز کئے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجئے تاکہ میں انتخاب کر سکوں"[۱]

ستمبر ۱۹۱۵ تک یہ مثنوی چھپ کر اکبر کو مل چکی تھی۔ چنانچہ جونپور سے ۸ ستمبر ۱۹۱۵ کو عبدالماجد دریا بادی کے نام ایک خط میں انہوں نے "اسرارِ خودی" کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:

"دو نئی تصنیفیں نظر سے گذریں، ایک "معارج الدین"، مصنفہ مولوی نواب علی صاحب کی حمایت کی ہے۔ دوسری "اسرارِ خودی"، مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب، جس میں مصنف

۱۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم، صفحہ ۳۶۸

اس بحث کو بڑی تفصیل سے جناب عبداللہ قریشی صاحب نے اپنے مضمون "معرکہ اسرارِ خودی" مطبوعہ اقبال اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پیش کیا ہے۔ ہم نے یہاں اس معرکے کے صرف انہی پہلوؤں کو لیا ہے جو اکبر اور اقبال کے باہمی روابط کے سلسلے میں ضروری تھے۔

نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت اثر ہوا، صحیح نہیں ہے خودی کو بڑھانا چاہیئے۔ دونوں کتابیں آپ کے ملاحظہ کے قابل ہیں۔ مثنوی کی نسبت تو کچھ زیادہ نہ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے، اشعار نہایت اچھے ہیں

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص　　　　می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

ایم۔ اے، بڑودہ کالج، جس میں سائنس اور فلسفہ پر ریویو کر کے مصنّف نے مذہب یہ خود ہی کاٹتی اور تصوّف ہے۔ دیباچے میں پولٹیکل دانشمندی بھی ہے "۱

یہ اکبر کے ابتدائی "تاثرات" تھے جو انہوں نے اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" کو دیکھ کر ایک خط میں ظاہر کئے۔ تصوّف کے بارے میں اقبال کے طرزِ عمل سے وہ چونکے "ضرور ہوئے۔ اور ممکن ہے حافظ کے متعلق اقبال کے درشت لہجے سے وہ کچھ بددل بھی ہوئے ہوں تاہم انہوں نے مثنوی کو نیک نیّتی اور خلوص پر مبنی سمجھا اور عملی نتائج کے اعتبار سے اس کے نقشِ خیال کو سمجھنے کی کوشش جاری رکھی۔ چنانچہ مرزا سلطان احمد کو ایک مکتوب (۲، اکتوبر ۱۹۱۵) میں لکھتے ہیں۔

"اسرارِ خودی" پر آپ کا ریویو جس پرچے میں چھپے مرحمت فرمایئے گا بلحاظ عملی نتائج کے میں ہنوز ان کے نقشِ خیال پر ایسا حاوی نہیں ہو سکا کہ مناسب داد دے سکوں۔ لیکن خوبیٔ مقصود اور ترکیبِ اشعار کا کیا کہنا "۲

اسی اثناء میں "اسرارِ خودی" کے خلاف اور تصوّف کی حمایت میں بحث و تکرار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غالباً اس سلسلے کا پہلا مضمون دہلی کے کانگریسی لیڈر مولانا عارف ہسوی نے لکھا اور ملّا واحدی کے اخبار "الخطیب" میں چھپنے کے لئے بھیجا۔ خواجہ حسن نظامی نے اس مضمون کی اشاعت روک کر اکبر کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا۔ اکبر اس کے جواب میں خواجہ حسن نظامی کو (۲۵ ستمبر ۱۹۱۵) خط میں لکھتے ہیں:۔

۱۔ "خطوطِ مشاہیر" مرتبہ عبدالماجد صفحہ ۸۲۔ (۲) "مکتوباتِ اکبر" صفحہ ۶۵ (۳) خطوطِ اکبر صہ ۱۶

"مکرمی، سلمہ اللہ تعالیٰ، آپ کی دانش مندی، حفظ مراتب، محبت و ہمدردی کا شکر گزار ہوں آپ نے خوب کیا مضمون رکوا دیا۔ میں نے بھی لکھ بھیجا۔ اگرچہ دوسرے کی تحریر سے مجھ کو کیا تعلق، مگر اس وقت اسکا ذکر ہو ہی کیوں؟

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

پر عمل چاہیئے"

اس کے بعد خواجہ حسن نظامی خود اس میدان میں کود پڑے۔ اقبال نے بھی جواب میں مسئلہ تصوف پر مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ "خطیب" (دہلی)، "صوفی" (دہلی)، "الناظر" (لکھنؤ) "نیما یرا" (لکھنؤ)، "معارف" (اعظم گڑھ)، "وکیل" (امرتسر)، "ستارۂ صبح" (لاہور) وغیرہ یہ جرائد اس معارضے کے اہم نقیب تھے۔ اس معرکہ آرائی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ خواجہ حسن نظامی اور اقبال دونوں کی داد خواہی کا مرکز بھی اکبر کی ذات و شخصیت تھی۔ اکبر کے لئے یہ ایک بڑا نازک سا مرحلہ تھا۔ وہ اقبال کے بھی قدر دان تھے اور خواجہ حسن نظامی کے بھی بہی خواہ تھے، علاوہ بریں تصوف و روحانیت سے انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ اگرچہ غالب کی طرح رسماً صوفی تو وہ بھی نہیں تھے۔ اس لئے تصوف پر اس حملے سے وہ جز بز ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حافظ اور افلاطون پر اقبال کی کڑی نکتہ چینی کو بھی انہوں نے ناپسند کیا، اور سچ تو یہ ہے کہ حافظ کے بارے میں اقبال ذرا ذہنی اعتدال کا ثبوت دیتے اور لہجہ ایسا دلآزار اختیار نہ کرتے تو شاید یہ بحث شروع ہی نہ ہوتی، اور اگر شروع ہوتی تو اتنی شدت اور طوالت اختیار نہ کرتی لیکن اقبال نے تو بقول خود "محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح"[1] کی خاطر یہ اسلوب اختیار کیا تھا، اور اکبر کا خیال یہ تھا کہ اقبال کا موقف خواہ درست ہی ہو لیکن اس کے اظہار کا "جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ دل شکن اور ضرر رساں ہے"۔[2] اور اگر

۱۔ "اقبال نامہ" حصہ اول، صفحہ ۵۲۔

۲۔ "خطوط اکبر" صفحہ ۴۱۔

اس سے ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہوا تو یہ ایک قدرتی بات تھی، حافظ محمد اسلم جیرا جپوری بھی جنہوں نے "الناظر" میں "اسرارِ خودی" کی حمایت میں ایک زور دار مضمون لکھا تھا، اقبال کے اس رویے سے مطمئن نظر نہیں آتے چنانچہ لکھتے ہیں "ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ حافظ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اگر وہ نہ لکھتے تو بہتر تھا" [1] اور بالآخر اقبال بھی ان اختلافی اشعار کو حذف کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظ شیراز کے بارے میں یہی لٹریری اصول خود اکبر کا بھی ہے اور وہ اقبال سے بہت پہلے اس کا اظہار بھی کر چکے تھے چنانچہ اپنی مشہور نظم "برق کلیسا" (تخلیق ۱۹۰۷ء) میں وہ ایک شعر میں فرماتے ہیں:۔

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ　　　دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

اجتماعی ملی نقطۂ نظر سے یہاں اکبر نے بھی کم و بیش وہی بات کہی ہے جو آگے چل کر اقبال نے "اسرارِ خودی" میں کہی فرق صرف اتنا ہے کہ اکبر نے اسے نزاعی مسئلہ نہیں بنایا صرف شعری کنائے میں حقیقتِ حال بیان کر دی ہے۔

اکبر نے اس معرکہ آرائی کے دوران میں وقتاً فوقتاً جو خطوط مختلف حضرات کو لکھے ان میں اپنے ذہنی ردِ عمل کو پیش کیا ہے اس قسم کے خطوط میں کسی وحدتِ فکر کی تلاش عبث ہے اور پھر اکبر کے یہ خطوط مختلف طرح کے جذباتی اتار چڑھاؤ اور جسمانی عوارض کے عالم میں لکھے گئے اس لئے کچھ خط ایسے بھی ہیں جن میں بالکل ہیجانی کیفیت غالب ہے اور چند ایک مقامات پر تو انہوں نے سخت اور درشت لہجہ بھی اختیار کر لیا ہے، مثلاً:

" اقبال لکھتے ہیں کہ میں بھی مضمون لکھوں گا، نہایت افسوس کی بات ہے روز دال اقبال سے مجھ کو بہت ہی ملال ہوا ہے۔ اس باب میں پھر لکھوں گا میں اقبال کو لکھوں گا کہ اگر ممکن ہو تو اپنی قابلیت کو کسی بہتر اور نتیجہ خیز کام میں صرف کریں۔" (خط بنام

---

[1] "نوادرات" علامہ اسلم جیرا جپوری، صفحہ ۱۱۔

خواجہ حسن نظامی، یکم جنوری ۱۹۱۶)

"اقبال صاحب کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مغرب و مشرق دونوں کے لئے بھیانک ہو گئی ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے۔" (خط بنام خواجہ حسن نظامی، ۲ فروری ۱۹۱۶)

"اقبال صاحب کی طبیعت نے عجیب تنگ اور بے سود راہ اختیار کی ہے دیدنی ہے جہانِ زنگار رنگ۔" (خط بنام عبدالماجد دریا بادی، ۲۵ اگست ۱۹۱۷)

یہ باتیں اکبر کے مزاج اور افتادِ طبیعت سے مختلف ہیں اور کسی ہیجانی لمحے ہی کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم اکبر کو اقبال کی ذات سے جو دلچسپی تھی اس کے پیشِ نظر انہیں اقبال کی روش پر سخت تاسف تھا۔ اور ان تلخ اور انتہاپسندانہ باتوں میں بھی رنج و تاسف کا یہ احساس ملا ہوا ہے۔

اس مسئلے پر اکبر اور اقبال کے درمیان بھی خط و کتابت ہوتی رہی

۔ اقبال نے اکبر کے نام اپنے بعض خطوط میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اقبال کے نام اکبر کے خطوط کی عدم موجودگی میں تصویر کے دوسرے رخ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اکبر کے وہ خطوط جو انہوں نے دیگر حضرات، علی الخصوص خواجہ حسن نظامی کے نام لکھے، اس پہلو پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔

اکبر کو تصوف سے لگاؤ ضرور تھا تاہم وہ ایک وسیع النظر اور منصف مزاج انسان تھے۔ تصوف کی بحث و تکرار میں عام طور پر انہوں نے فریقین کے درمیان جس طرح انصاف پسندی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا وہ ان کے منصفانہ مزاج کا مظہر ہے۔ تصوف کی اس ناخوشگوار بحث میں اقبال اور خواجہ حسن نظامی کو توازن و اعتدال کی راہ پر ڈالنے کے لئے اکبر ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اعلیٰ قومی مقاصد کی خاطر فریقین کو بے راہ رو ہونے سے اکثر ٹوکتے رہتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کو ایک خط (۲۱ جنوری ۱۹۱۶) میں لکھتے ہیں:

"حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہو گا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلہ وحدت الوجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے میں آپ کو مناسب اور محفوظ جگہ میں نہ پاؤں گا اگر آپ قرآن مجید سے مسئلہ وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لئے قلم اٹھائیں گے۔ علمائے شریعت نے غالباً فرما دیا ہے کہ یہ مسئلہ جزو اسلام نہیں ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہمہ اوست کہنے سے پہلے 'او' کو ثابت کرو پھر 'ہست' کی توضیح کرو یعنی ہستی کیا چیز ہے اور 'او' کسے کہتے ہیں، ہمہ اوست تک پہنچنے ہی نہ پاؤ گے کہ حواس شریف تشریف لے جائیں گے۔ حضرت اقبال خودی کو بڑھا کر ہمہ منم کہہ دیں تو مطلب حاصل ہے"[1]

اکبر اقبال کو بھی اس طرح بحث کی تلخ کلامی سے محترز رہنے کی تلقین کرتے تھے جواب میں اقبال اپنے موقف کی وضاحت کرتے تھے اسی سلسلے میں اکبر خواجہ حسن نظامی کو ایک خط (۲ نومبر ۱۹۱۶) میں لکھتے ہیں :

"اقبال صاحب کا خط آیا ہے لکھتے ہیں "میں تصوف کے خلاف نہیں ہوں، صرف چند مسائل سے اختلاف ہے"۔ جو کچھ ہو شکستگی دل بری چیز ہے یا گداز دل کیسے یہ نہیں تو وہ رنگ نہیں رہیں نے لکھ دیا کہ خواہش یہی ہے کہ آپ محبوب طلوب رہیں"[1]

اقبال کے خیال اور لہجے میں ذرا تبدیلی پیدا ہوئی تو اکبر کو اس سے ایک گونہ مسرت ہوئی۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی کو ایک خط (۱۷ نومبر ۱۹۱۶) میں لکھتے ہیں۔

"..... حضرت اقبال کے خیالات میں بہت تبدیلی ہوئی یا کم سے کم ان کا اظہار ہوا اب ان کو اچھی اور منضبط و مربوط سوسائٹی مل جائے گی"۔[2]

اسی زمانے میں خواجہ حسن نظامی کی تصنیف "محرم نامہ" چھپی، اکبر اس کی تعریف

۱۔ "خطوط اکبر" بنام خواجہ حسن نظامی، صفحہ ۶۱۔

۲۔ ایضاً صفحہ ۶۳

کرتے ہیں لیکن "اسرارِ خودی" کے مقابلے میں اسے کم تر درجے کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اپنی اس بے لاگ رائے کا اظہار بھی خواجہ حسن نظامی ہی کے نام ایک خط (۲۸ نومبر ۱۹۱۶) میں کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"۔۔۔ محرم نامہ، اسرار خودی ابھی تک نہیں پہنچا مگر ہے قابلِ داد۔ اچھا ہے اقبال کا کچھ جواب ہو جائے۔"[۱]

اقبال کا ایک مضمون تصوف کے خلاف "نیو ایرا" میں چھپا۔ یہ مضمون اقبال نے اکبر کے ملاحظے کے لئے بھی بھیجا۔ اکبر نے اس کے کچھ مندرجات سے اتفاق کیا اور باقی سے اختلاف۔ حسن نظامی کو ایک خط (۳۰ اگست ۱۹۱۷) میں لکھتے ہیں :

"مکرمی، سلمہ، "نیو ایرا" جو لکھنؤ سے انگریزی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ ۲۸ جولائی کا پرچہ اقبال نے میرے پاس بھجوا دیا ہے۔ اس میں ان کا ایک آرٹیکل تصوف کے خلاف چھپا ہے[۲] مگر میں نہیں جانتا وہ کون سا اسلامی مقہور تصوف ہے جو انسان کو دنیا میں سعی سے روکتا ہے۔ بہر حال پڑھے لکھوں کا یہ پرانا شغل زندگی ہے۔ انسان کو ضرور مردانگی سے کام لینا چاہیئے۔ لیکن کالج کی پروفیسری عرب کی مردانگی نہیں ہے جس کا وعظ کہا جاتا ہے۔ اعمال نیک اور تقویٰ ہی میں مردانگی ہے۔ اقبال نے یہ ٹھیک لکھا ہے کہ ایران نے مذاق عرب کو خراب کیا۔"[۳]

پھر ایک دوسرے خط (۴ ؍ اگست ۱۹۱۷ء) میں لکھتے ہیں :

"اقبال صاحب مراسلت کرتے ہیں ان کا آز کیوں نہ کروں۔ لیکن دلی ذوق جاتا رہا۔ شریعت سے کس کو انحراف ہے۔ لیکن یہ رنگ کہاں کہ"

۱۔ خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی، صفحہ ۹۵۔
۲۔ "نیو ایرا" کا یہ مضمون اب سید عبدالواحد کی مرتبہ میں شامل ہے۔
۳۔ خطوطِ اکبر، بنام خواجہ حسن نظامی، صفحہ ۹۹۔

حلقۂ پیرِ مغانم ز ازل در گوش است

بر ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

قرآن مجید نے بھی اہل دل پر نظر فرمائی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب صرف اسی دل کو مانتے ہیں جو اینچ سے نپ سکے ۔ خیر یہ دور کی باتیں ہیں ۔ عبرت اور گداز دل کا تو رنگ ہو نہ ہو اور پھر تصوف کے بارے میں اکبر نے اپنے احساس کو ایک خط (۲۸ جنوری ۱۹۱۸ء) میں کس اچھوتے انداز میں ظاہر کیا ہے ۔

" اچھا ہے جواب مثنوی لکھا جائے ۔ لیکن تصوف کو کچھ اندیشہ یوں بھی نہیں ہو سکتا ۔ باغبان باغ چمن کو ہزار مقفل کرے نکہت گل اور باد نسیم کو کون روک سکتا ہے ۔ دماغ چاہیئے ۔ شریعت کو تو جانتے تھے لیکن شریعت اینڈ کو نئی چیز ہے ۔ اقبال صاحب ہمارے آپ کے دوست ہیں ۔ میں نے لکھا ہے کہ اپنی دین داری کو رحمت الٰہی ثابت کیجئے ۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے "۱

۱۹۱۸ء میں اقبال کی مثنوی " رموز بے خودی " شائع ہوئی اور انہوں نے حسب معمول اس کی ایک جلد اکبر کو ارسال کی ۔ اکبر اس زمانے میں بہت زیادہ اختلاط صحت کا شکار ہو چکے تھے ۔ امراض کے حملے بھی دم نہ لینے دیتے تھے ۔ کچھ اس لئے اور کچھ تصوف کی بحث نے طبیعت میں جو ملال سا پیدا کر دیا تھا اس وجہ سے انہوں نے اس پر کوئی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا ۲ مرزا سلطان احمد کے نام ایک خط (۱۷ اپریل ۱۹۱۸ء) میں

۱۔ خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی ، صفحہ ۹۹ ۔

۲۔ " اسرار خودی " کی تمہید میں اقبال نے خواجہ حافظ شیرازی پر جس تند و تلخ انداز میں تنقید کی تھی اس سے ان کے اکثر بہی خواہ آزردہ تھے ۔ اس لئے بعید نہ تھا کہ " اسرار " کے بعد " رموز " کے بارے میں ردعمل کا اظہار محتاط لہجے میں کیا جاتا ۔ اقبال کے ایک بڑے ممدوح مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی " رموز بے خودی " کی وصولی کی رسید دیتے ہوئے (غالباً مطالعہ رموز "

(باقی اگلے صفحہ پر)

اکبر لکھتے ہیں ۔

"اقبال صاحب نے مثنوی" رموز بے خودی" عنایت فرمائی ہے لیکن میں نے ہنوز نہیں دیکھی، نہ اس کی امید ہے، نہ دل چاہتا ہے ۔ ہیجان خلط سودا نے پریشان کر رکھا ہے۔ مسکنات استعمال کر رہا ہوں ۔ دل و دماغ پریشان اوقات، قابو نہیں رہتا ۔ دعائے مغفرت فرمایئے گا ۔ اب دنیا سے بہت دل برداشتہ ہو گیا ہوں ۔ آپ ایسے دوست نہایت کم ہیں ۔ اسرار خودی کی تمہید دیکھ چکا ہوں ۔ میرے کلیات کے حصہ اوّل میں صفحہ ۹۵ میں ایک شعر آپ ملاحظہ فرمائیں گے ۔

خودی و بے خودی دونوں ہیں عکس صورت جاناں
اسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

یہ شعر ابتدائی زمانے کا ہے لیکن "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" دونوں پر حاوی ہے ۔ مولانا روم اور مسٹر ٹلک کا مرکب بہت قوی جاتا ہے (۹) جو کچھ ہو میں نے تو اسے پڑھا ہی نہیں ۔ آپ نے ماحصل نکالا ہو تو لکھ بھیجیے گا ۔ میں تصنیفوں کو نثر میں بہتر

حاشیہ صفحہ گذشتہ

سے قبل، اقبال کے نام اپنے خط (۲۸ جون ۱۹۱۸) میں لکھتے ہیں ۔

"اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ آپ کی سحر بیانی اور علو خیالات اور خیالات میں جدت یہ سب سامان جس نظم میں موجود ہوں اس نظم کو پڑھ کر آفرین یا سبحان اللہ کہنا مبالغہ نہیں ہو سکتا ۔ البتہ جوش بے خودی میں اگر حافظ یا دوسرے خدا کے دیوانے اور اس کی محبت کے مخبوط اور جنونی لعنت و ملامت کے مستحق نہ سمجھے جائیں تو پھر وہ نظم بلائیں لینے کے قابل ہے ۔ یقین ہے کہ اب کی دفعہ ضرور بیچارے حافظ مرحوم نشانہ تو نہ ہوئے ہوں گے ۔"

(بحوالہ ۔ شاد اقبال ۔ مرتبہ ڈاکٹر زور صفحہ ۸۷)

خیال کرتا ہوں [1]۔ اکبر کی نظم "ملّا اور صوفی" اپریل ۱۹۱۸ء کے "معارف" میں چھپی۔ [2]

اکبر نے اس نظم میں دونوں متحارب گروہوں کو شاعرانہ انداز میں باہمی بحث و تکرار سے محترز رہنے کی تلقین کی تھی کیونکہ اس ملی انتشار سے قوم کو نقصان پہنچ رہا تھا اور اغیار اس حالت پر خندہ زن تھے۔ اقبال کو اس نظم کے بعض مندرجات پسند نہ آئے اور انہوں نے خط کے ذریعے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اکبر اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کو ایک خط (۲۷ مئی ۱۹۱۸ء) میں لکھتے ہیں۔

.... آپ نے "ملّا و صوفی" کی نظم کو خوب زندگی بخشی۔ اقبال صاحب اس سے خوش نہ ہوئے۔ خط آیا۔ لیکن میں نہیں سمجھا کہ وہ کس حق سے مُلّا بنتے ہیں۔ میں تو صوفی بنتا نہیں۔ شاعری کا کچھ مذاق ہے۔ اگرچہ بقول آپ کے شاعری اور تصوّف اور فلسفہ سب ایک ہے۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ "میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں" جس کے معنی ہوئے شخصی۔ یہ لفظ مغربی مصنفوں نے اختیار کیا ہے بمقابلہ فلاسفہ کے خدا کے جس کا وجود عالم ہی کے ساتھ اور اسی میں طاری و ساری ہے الگ نہیں ہے۔ اقبال صاحب کا مطلب ہے کہ ہندو فلاسفی الگ خدا کو نہیں مانتی اور صوفی بھی ہمہ اوست کہتے ہیں لیکن میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں۔ اس باب میں آپ نے صحیح لکھا ہے کہ یہ بحث ہی نہ کرنا چاہیے۔ اسی نے اختلاف ڈالا ہے جو قرآن میں ہے وہی کہو۔ پرسنل گاڈ کہنا اتنا ہی بے جوڑ ہے جس قدر ہمہ اوست کہنا۔ بلکہ ہمہ اوست میں تو ایک بات ہے۔ عربی الفاظ اور قرآن کی اصطلاح چھوڑ کر پرسنل گاڈ کیا معنی۔ یہ میں آپ کو پرائیویٹ طور پر لکھتا ہوں۔ مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا پوزیشن یا درجہ اپنا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اقبال صاحب

۱۔ مکتوباتِ اکبر۔ صفحہ ۹۳، ۹۴۔
۲۔ ملّا اور صوفی۔ معارف اپریل ۱۹۱۸ء (نمبر ۱۰، جلد ۲) میں فریادِ اکبر کے عنوان سے چھپی تھی۔ (یہ نظم ضمیمہ ب میں ملاحظہ کیجیے)

نیک نیتی سے احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ پروفیسر بھی تو ہیں: ![1]

عبدالماجد دریا بادی نے نظم "ملا صوفی" کو پسند کیا۔ اکبر نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور اپنے جوابی خط (۱۱ جون ۱۹۱۸ء) میں اقبال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے واضح ہوتا ہے کہ اکبر حافظ کے بارے میں اقبال کے تند و تلخ اشعار سے کتنے رنجیدہ تھے۔ تاہم وہ اقبال کو طبعاً پر خلوص اور نیک نیت سمجھتے تھے۔

"میں خوش ہوا کہ آپ نے اس مضمون کو حرف بحرف پسند کیا۔ بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑا تھا۔ سید سلیمان صاحب شوق و اصرار سے لے گئے تھے۔ میرے پاس تو صد ہا قطعات اور مثنویاں موجود ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیراز کو علانیہ برا بھلا کہا ہے میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی "اسرار خودی" آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب مثنوی "رموز بے خودی" شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہیں دیکھی۔ دل نہیں چاہا۔ خط و کتابت ہے، لیکن میں ان کے انقلاب طبیعت سے خوش نہیں ہوں۔ ہونا اچھا بننا برا"[2]

بالآخر اقبال نے "اسرار خودی" سے حافظ کے بارے میں ان قابل اعتراض اشعار کو حذف کر دینے کا فیصلہ کر لیا جن کی بدولت اس معارضے میں زیادہ تلخی پیدا ہوئی تھی اور اقبال کے اکثر بہی خواہ بھی بد دل اور رنجیدہ خاطر ہوئے تھے۔ اقبال نے اپنا یہ ارادہ ایک خط میں اکبر پر ظاہر کیا اور اکبر نے ان کے اس فیصلے پر طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی کو ۱ مئی ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھا۔

". . . . اقبال صاحب نے لکھا ہے کہ آئندہ ایڈیشن سے تنکا بیت حافظ کو خارج کر دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ بہت اچھی بات ہے"[3]

۱۔ واقعات اکبر۔ مرتبہ ہمایوں نصیر، صفحہ ۲۹، ۳۰

۲۔ خطوط مشاہیر، مرتبہ عبدالماجد، صفحہ ۱۳۵۔

۳۔ خطوط اکبر، خواجہ حسن نظامی، صفحہ ۱۱۳۔

اور اس طرح یہ ناخوشگوار معارضہ اپنے پیچھے چند تلخ یادیں چھوڑتا ہوا انجام کو پہنچا!

اس ناخوشگوار معارضے کے سلسلے میں اکبر اور اقبال کے حوالے سے جو ضروری باتیں تھیں وہ بیان کر دی گئی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اکبر نے اس بحث کو ختم کرنے اور خواجہ حسن نظامی اور اقبال کو اعتدال کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے میں مصالحت کنندہ کا کردار انجام دیا۔ دونوں اصحاب کے بیانات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اقبال ۱۱ جنوری ۱۹۱۸ء کو ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ جن خیالات کا اظہار میں نے اخبار "وکیل" میں کیا تھا ان کی صحت و صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے گو ان پر بحث کرنا کئی وجوہ سے غیر ضروری جانتا ہوں۔ عوام بلکہ خواص کو بھی ان اصولی امور میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لئے موزوں ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ مولانا اکبر نے (جن کا ادب و احترام میں اس طرح کرتا ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا احترام کرے) مجھے لکھا کہ یہ بحث غیر ضروری ہے۔ اس دن سے آج تک میں نے ایک سطر بھی ان مباحث پر نہیں لکھی۔"

(بحوالہ انوار اقبال صہ ۱۸۵) خواجہ حسن نظامی نے "خطیب" میں یہ لکھا:

"گزشتہ ایام میں جناب شیخ اقبال صاحب بیرسٹر پی۔ ایچ۔ ڈی اور حسن نظامی کے درمیان مسئلہ تصوف میں اختلاف واقع ہوا تھا۔ گفتگو آگے بڑھتی مگر ایک طرف تو جناب ڈاکٹر صاحب کو مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی نے روکا اور دوسری جانب مجھے بھی ممانعت فرمائی۔ میں حضرت اکبر کی ذات کو اپنا مرشد معنوی تصور کرتا ہوں۔ اس لئے اس گفتگو سے دستبردار ہو گیا اور خلقت کی اس شہرت کو برداشت کرتا رہا کہ حسن نظامی اقبال سے علمی بحث نہ کر سکا کیونکہ بدنامی بہتر تھی۔ اپنے رہنمائے مرشد کی عدم تعمیلِ ارشاد سے۔" (بحوالہ انوار اقبال، صفحہ ۱۸۶)

یہ ہے مختصر سی روداد، مشرق کے دو مفکروں اور ملی شاعروں اکبر اور اقبال

کے باہمی تعلقات کی۔ یہ تعلقات اور ان کی ابتدا شخصی تقاضوں کے ماتحت نہیں ہوئی بلکہ اس کے پیچھے ملی احساس کارفرما تھا۔ اکبر نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں ملی احساس کو زندہ رکھنے اور بقول اقبال "ٹھیٹھ اسلام کا سچا نمونہ پیش کرنے" (بحوالہ "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر") کے سلسلے میں جو فریضہ سرانجام دیا وہ تاریخ کی ایک زندہ اور ٹھوس حقیقت ہے اکبر نے ایسے غیر معمولی حالات میں حق کی آواز کو بلند کیا جب اس کی قدر و قیمت کو سمجھنے والے خال خال لوگ تھے۔ ان کی آواز کو سنا تو سب نے، لیکن کسی نے اسے ترقی و روشنی کے نئے زمانے میں قدامت کی دم توڑتی ہوئی چیخ و پکار سمجھا، کسی نے اسے گزرتے وقت کی راگنی قرار دیا۔ اکبر کو اپنی تنہائی اور بے کسی کا خود بھی احساس تھا۔

کیا کام چلے کیا رنگ جمے کیا بات بنے کون اس کی سنے
ہے اکبر بے کس ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف

لیکن ایک باشعور فنکار کی حیثیت سے اکبر اپنی منفرد آواز کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے۔ وہ سطح کے خس و خاشاک سے بلند ہو کر نتائج و عواقب کو دیکھ رہے تھے اور نامساعد حالات میں بھی اپنی فریاد و فغاں کو تاحدِ امکان جاری رکھنے کی کوشش کر رہے تھے:

فریاد کیے جا اے اکبر کچھ ہو ہی رہے گا آخر کار
اللہ سے توبہ ایک طرف، صاحب کی دہائی ایک طرف

یہ فریاد و فغاں بالآخر رنگ لائی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں لوگ اکبر کی صدائے پُردرد کی اہمیت سے جو بظاہر ظرافت کا لبادہ اوڑھے تھی، آگاہ ہو رہے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اقبال نے ہنگامہ ہائے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور ابتدائی دور کے ہیجان و اضطراب سے گزر کر بالآخر وہ بھی اسی راہ پر پہنچے جہاں اکبر مدت سے کھڑے "خدا کی باکی" کا نعرہ مستانہ پکار رہے تھے اور "بتوں" کی ناخوشی کا خطرہ مول لے

رہے تھے :

خدا کی پاکی پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کو
مری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کرے گا

اقبال نے اکبر کے تہذیبی و معاشرتی مشن کو اپنے شعری رنگ اور فلسفیانہ آہنگ میں پیش کرکے سفینۂ ملّی کی ناخدائی کا فن کارانہ فریضہ سرانجام دیا۔ اس لحاظ سے اکبر اقبال کے صحیح معنوں میں پیش رو تھے اور اقبال پیر رومی کی طرح اس عارف مشرق کی فکری رہنمائی کو بھی اپنے لئے باعث سعادت سمجھنے میں حق بجانب تھے۔

باب دوم

خطوطِ اقبالؒ بنام اکبرؒ

ذیل میں وہ خطوط دیتے جاتے ہیں جو علامہ اقبال نے لسان العصر اکبر الہ آبادی کو لکھے اور مجموعہ مکاتیب (اقبالنامہ حصہ دوم) میں شامل ہیں۔ ان خطوط کی تعداد سولہ ہے۔ دیگر حوالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصل تعداد زیادہ ہے۔ ممکن ہے کچھ خطوط ضائع ہو گئے ہوں یا اکبر کے ورثا کے پاس یا کہیں اور موجود ہوں اور کبھی علمی دُنیا کے سامنے آجائیں۔ زیرِ نظر خطوط میں تاریخ کے شروع کے دو ہندسوں کی بجائے چاروں ہندسے (یعنی مکمل سنہ درج کیا گیا ہے) وضاحت طلب امور کے بارے میں حاشیے میں وضاحت کر دی گئی ہے۔

لاہور۔

۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ سید صاحب، السلام علیکم

کل ظفر علی خانؔ[۱] صاحب سے سُنا تھا کہ جناب کو چوٹ آگئی۔ اُسی وقت سے میرا

۱۔ مولانا ظفر علیخاں، مدیر زمیندار (ولادت ۱۸۷۳ء، وفات ۲۷ر نومبر ۱۹۵۶ء)

دل بے قرار تھا اور میں عریضہ خدمتِ عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ ملا۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان کے مسلمان اُس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

مَیں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مُرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور مَیں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن مَیں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے:

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن[۱] کہتے ہیں "جتنا بڑا شہر ہو اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے"۔ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے اس کے علاوہ گذشتہ ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور ان ہی میں طبعِ سلیم میرے لئے شکنجے کا کام دے گئی۔ کیا خوب کہہ گیا ہے عُرفی:

رُستم ز مدعی بقبول غلط ولے
در تابم از شکنجۂ طبعِ سلیم خویش

ناتمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائے۔ مجھے یہ سُن کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں۔

۱۔ سر فرانسس بیکن، انگریز فلسفی ادیب (ولادت ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء - وفات ۹ اپریل ۱۶۲۶ء)

"غرۂ شوال"[1] پر چند اشعار لکھے تھے۔ زمیندار اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے۔ اُن کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ مَیں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ٹرکی واٹلی کی جنگ نے ان کی تصدیق کر دی ہے۔ اگر زمیندار اخبار آپ تک نہ پہنچا ہو تو تحریر فرمائیے، بھجوا دوں گا۔

خواجہ حسن نظامی[2] واپس تشریف لے آئے۔ مجھے بھی اُن سے محبت ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسولؐ نصیب کرے۔ مُدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے کب جوان ہوتی ہے شیخ عبدالقادر[3] لائل پور میں سرکاری وکیل ہو گئے۔ اب وہ لاہور سے وہاں چلے گئے۔ کچھ دن ہوئے یہاں آئے تھے مگر میں اُن سے نہ مِل سکا۔ آرڈر قائم کرنے کا خیال تھا اور اب تک ہے۔ مگر اس راہ میں مشکلات بے حد ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس مذاق کے لوگ کہاں ہیں۔ بہر حال مَیں ہم خیال پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں اور کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ آپ دعا کریں۔

خیریت مزاج سے مطلع کیجئے۔ مجھے اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ خدا آپکو صحت کامل کرامت فرمائے۔

دعاگو، محمد اقبال۔ بیرسٹر، لاہور

لاہور، ۹ نومبر ۱۹۱۱ء

"مخدومی! السلام علیکم۔ آپ کے دونوں نوازش نامے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔

۱۔ یہ نظم بعد میں بانگِ درا میں شامل ہوئی، صفحہ ۱۹۹ (غرۂ شوال یا ہلالِ عید)

۲۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی، مدیر نظام المشائخ، اُردو کے صاحبِ طرز ادیب، صوفی (ولادت ۱۸۷۸ء، وفات: ۱۹۵۵ء)

۳۔ شیخ سر عبدالقادر، بیرسٹر، مدیر مخزن (ولادت ۱۸۷۴ء لدھیانہ، وفات: ۹ فروری ۱۹۵۰ء)

الحمد اللہ کہ جناب خیریت سے ہیں ۔

ترکوں کی فتح[1] کا مژدۂ جانفزا پہنچا۔ مسرت ہوئی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں رُوح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ میں ایک زبردست تمنّا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں۔ گو اس تمنّا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لاہور کی بستی میں کوئی ہمدمِ دیرینہ نہیں۔ نام و نمود پر مرنے والے بہت ہیں۔ قومی جلسوں سے بھی پہلو تہی کرتا ہوں۔ ہاں آپ کے خطوط جو میرے پاس سب محفوظ ہیں، بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا ہے کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجئے مگر میں خود لمبا خط لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں، یہ ایک قسم کی رُوحانی خود غرضی ہوگی جس کا ارتکاب میرے نزدیک گناہ ہے۔ آپ کی ملاقات کے لئے دل تڑپ رہا ہے۔ خدا جلد کوئی سامان پیدا کرے۔ کیا آپ دربار کے موقع پر دہلی تشریف لائیں گے[2]۔

زمیندار میں یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ "اُردو شاہنامہ" تلف ہوگیا[3]۔ جو شعر اس میں سے شائع ہوئے ہیں وہ بڑے زور کے ہیں:-

رگِ موج سے خون جاری کریں

اس مصرع پر تو فردوسی اور نظامی بھی رشک کرتے ۔

۱۔ ٹرکی اور اٹلی کے درمیان طرابلس (لیبیا) میں جنگ ہو رہی تھی۔ یہ جنگ ستمبر ۱۹۱۱ء میں شروع ہوئی۔

۲۔ دہلی کا شاہی دربار جس میں جارج پنجم قیصرِ ہند شریک ہوئے تھے۔

۳۔ جنگ روم و روس (۱۸۷۷ء) کے موقع پر اکبر نے یہ نظم کہی تھی۔ اس کا کچھ حصّہ (۱۲۴ اشعار) علی گڑھ میگزین اکبر نمبر میں چھپ چکا ہے۔ مذکورہ بالا مصرعے کا پہلا مصرع یہ ہے : "جو دریا پہ یہ تیر باری کریں"

ہاشم طالؔ عمرہ[۱] کو میری طرف سے بہت بہت پیار کیجئے۔ میری رُوح کو اس نام سے ایک خاص تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کی عمر دراز کرے اور دین دُنیا میں اُسے بامراد کرے۔ سکول کی خواندگی میں اس کا وقت ضرور ضائع ہوتا ہوگا۔ مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیرانِ مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے۔ یہی نظر صبغۃ اللہ ہے واحسن فی صبغتہ اللہ!

اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیرانِ مشرق دُنیا میں نہ رہیں گے اور آئندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہونگے۔

میاں ہاشم! اب وقت ہے، اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیرِ مشرق سے لے سکتے ہو لے لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آتے گا۔ اس تربیت کے فیض سے زندگی بھر تمہاری رُوح لذت اُٹھائے گی!

خادم، محمد اقبال، لاہور

لاہور

۱۶ر جولائی ۱۹۱۴ء

مخدوم مکرّم حضرت قبلہ مولٰنا، السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو اپنا پیرو مُرشد تصوّر کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں، بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اُس وقت بھی میری اِرادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاءاللہ جب تک میں

۱۔ اکبر الٰہ آبادی کا چھوٹا فرزند، جون ۱۹۱۳ء میں چودہ سال کی عمر میں چیچک بخار میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔

زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دُنیا متفق اللّسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصولِ دولت و جاہ نہیں محض اظہارِ عقیدت ہے۔

عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اُس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظ دیگر اس کی تتبع کرکے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں نے بھی اسی خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان و بد مذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا ہے اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لئے۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔ نقّاد کو جو خط آپ نے لکھا ہے میں اُسے شوق سے پڑھونگا۔ اگر وہ شائع ہو جائے تو رسالہ کی کاپی بھیج دیجیئےگا میرے پاس نقّاد نہیں آتا۔

سبحان اللہ "غم بڑا مدرکِ حقائق ہے"[1] زندگی کا سارا فلسفہ اِس ذرا سے مصرع میں مخفی ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے لاہور میں اب کے بارش بالکل نہیں ہوئی۔ ابر روز آتا ہے مگر لاہور کی چار دیواری کے اندر اُسے برسنے کا حکم نہیں ہے۔ اگست کے ابتدا میں چند روز کے لئے شملہ جانے کا قصد ہے۔ کچہری تین اگست سے بند ہو جائے گی۔ والسلام۔

آپ کا خادم، محمد اقبال

لاہور

۱۷ر دسمبر ۱۹۱۴ء

مخدومی! السلام علیکم۔ کل خط لکھ چکا ہوں، مگر آپ کے اس شعر کی

۱۔ اکبر کے اس شعر کا پہلا مصرع یہ ہے: "ان مصائب سے کام لے اکبر"

داد دینا بھول گیا:

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ! کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ ہیگل[1] جس کو جرمنی والے افلاطون[2] سے بڑا فلسفی تصور کرتے ہیں اور تخیل کے اعتبار سے حقیقت میں ہے بھی افلاطون سے بڑا۔ اس کا تمام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا۔ یا یوں کہیئے کہ ہیگل کا سمندر اس قطرے کی تفسیر ہے۔[3]

ہیگل لکھتا ہے کہ اصلِ تناقض ہستیٔ محدود کی زندگی کا راز ہے اور ہستیٔ مطلق کی زندگی میں تمام قسم کے تناقض جو ہستیٔ محدود کا خاصہ ہیں، گداختہ ہو کر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔

کیمبرج کی تاریخ ہندوستان کے لئے جو مضمون اردو لٹریچر پر مجھے لکھنا ہے، اس میں اس شعر کا ذکر ضرور کروں گا[4]۔ اسی رنگ کے فلسفیانہ اشعار اور بھی لکھیئے کہ خود بھی لذت اٹھاؤں اور اوروں کو بھی اس لذت میں شریک کروں۔ آج مہاراجہ کشن پرشاد کا خط آیا تھا معلوم ہوا کہ خواجہ نظامی حیدرآباد سے اورنگ آباد چلے گئے۔ خلدآباد کی زیارت مقصود ہو گی۔ میں بھی وہاں گیا تھا۔

۱۔ ہیگل: ارنسٹ جارج ولیم فریڈرک جرمن فلسفی (ولادت: ۲۸ اگست ۱۷۷۰ء۔ وفات: ۱۴ نومبر ۱۸۳۱ء)

۲۔ افلاطون (PLATO) یونانی فلسفی، فلسفۂ اعیان کا بانی (۴۲۷ ق م۔ ۳۴۷ ق م)

۳۔ اکبر نے اپنے کلیات میں اس شعر پر حاشیہ لکھ کر اقبال کی اس تعریف کا اعتراف کیا ہے۔

۴۔ کیمبرج کی تاریخ کے لئے اقبال یہ مضمون نہیں لکھ سکے تھے۔ البتہ "نیو ایرا" میں اس پر ایک شذرہ لکھا تھا جو ضمیمہ الف میں دیا گیا ہے۔

اور عالمگیر علیہ الرحمتہ کے مزار پاک پر حاضر ہوا تھا۔ میرے بڑے بھائی بھی ساتھ تھے۔ کہنے لگے، میں قنات کے اندر نہ جاؤں گا (مزار کے گرد قنات تھی) کہ میری ڈاڑھی غیر مشروع ہے، والسلام۔

مخلص، محمد اقبال

لاہور
۱۸ ار اکتوبر ۱۹۱۵ء

مخدومی! تسلیم۔ آپ کا نوازش نامہ مل گیا تھا مجھے اس بات سے تردد ہے کہ آپ کی علالت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ آپکو جلد صحت کامل عطا فرمائے۔ آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے۔ اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو اُن سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ واعظِ قرآن بننے کی اہلیت تو مجھ میں نہیں ہے، ہاں اس مطالعہ سے اپنا اطمینانِ (خاطر) روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ گو عملی حالت کے اعتبار سے بہت سُست عنصر واقع ہوا ہوں۔ آپ دعا فرمائیں۔

شیعوں کے متعلق آپ نے خوب لکھا ہے۔ میرا مدت سے یہی خیال ہے۔ امامت کا مسئلہ سوسائٹی کو انتشار سے محفوظ رکھنے والا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ مذہبی حقائق کا معیار عقل ہو۔ میں نے کئی دفعہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صوفی بننے کی نسبت شیعہ ہو جانا ضروری ہے۔ اگر تقلید ضروری ہے، تو اولادِ علیؑ مرتضیٰ سے بڑھ کر اور کون امام ہو گا۔ البتہ امامت کے اصول میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ عوام کو مجتہدین سے تعلق رہتا ہے اور قرآن سے تعلق کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالکل کوئی تعلق نہیں رہتا۔

"مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے"[1] یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی[2] لکھنے کے لئے یہی خیال محرک ہوا۔ میں گذشتہ دس سال سے اسی پیچ و تاب میں ہوں۔

انیس احمد کو میں جانتا ہوں۔ انہوں نے ایک رسالہ تعلیم قرآن پر بھی لکھا تھا۔ اچھا رسالہ تھا مگر بعض لوگ اُن پر بدظن ہیں۔ چند روز ہوئے لاہور میں بھی آئے تھے۔ مجھ سے نہیں ملے۔ "معراج الدین" کہاں سے دستیاب ہوتی ہے؟

قرآن کے متعلق عربی میں بعض نہایت عمدہ کتابیں ہیں مگر افسوس ہے کہ لاہور میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ جرمنی کے علمائے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر جنگ کی وجہ سے وہاں سے نہیں آ سکتیں۔ انشاءاللہ بعد از جنگ بہت سی کتابیں علوم قرآنی کے متعلق وہاں سے منگواؤں گا۔ مدت ہوئی چند شعر فارسی کے لکھے تھے[3] عرض کرتا ہوں:

خوش آنکہ رختِ خرد ز شعلۂ مے سوخت
مثالِ لالہ متاع ز آتشے اندوخت
تو ہم ز ساغرِ مئے چہرہ را گلفام کن
بہار خرقہ فروشی بہ صوفیاں آموخت
دلم تپید ز محرومیِ فقیہِ حرم
کہ پیرِ میکدہ جامے بہ فتوائے نہ فروخت
مسنج قدرِ سرود از نوائے بے اثرم
ز برقِ نغمہ تواں حاصلِ سکندر سوخت

۱۔ اکبر کا اس مسئلے پر یہ شعر ہے: نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت تو وہ کیا ہے؟ فقط اک فلسفہ ہے
۲۔ مثنوی اسرارِ خودی۔
۳۔ یہ غزلیات چند ترمیمات کے ساتھ پیامِ مشرق میں شامل ہیں صد ۱۸۳ تا صد ۱۸۵

فزوں قبیلۂ آں پختہ کار باد کہ گفت
چراغِ راہِ حیات است جلوۂ اُمید
بیار بادہ کہ گردوں بکامِ ما گردید
مثالِ غُنچہ نواہا زشاخسار دمید
خورم بہ یادِ تنک نوشیِ امامِ حرم
کہ جز بصحبتِ یارانِ رازداں نہ چشید
چُناں زنقشِ دوئی شست لوحِ خاطرِ خویش
کہ وحشیِ توہم از آہوئے خیال رمید
نواز حوصلۂ دوستاں بلند تر است
غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچ کس نہ شنید

غالباً یہ اشعار آپ کے لئے نئے نہ ہونگے۔ کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید کچھ عرصہ ہُوا، میں نے یہ اشعار آپ کی خدمت میں تحریر کئے تھے۔ خیریتِ مزاج سے مطلع فرمائیے۔

آپ کا خادم۔ محمد اقبال

لاہور

۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء

مخدومی! السلام علیکم۔ نوازش نامہ ملا۔ دونوں اشعار لاجواب ہیں:

فطرت کی زباں جس کو سمجھو

سُبحان اللہ! یہ طرز اور معنی آفرینی خاص آپ کے لئے ہے۔ کوئی دوسرا یہاں مجال دم زدن نہیں رکھتا اور دُوسرا شعر: ؏

"________ ۔جو کچھ قسمت بھی ہوتی"

کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ اس کا لطف کم ہونے میں نہیں آتا

کبھی موقع ہوتا ہے تو دل کا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں۔ یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکرِ مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علما کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ اور اگر خدا تعالےٰ نے کوئی خاص مدد کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔

کئی صدیوں سے حکما اور صوفیا میں طاقت کے لئے جنگ رہی جس میں آخرکار صوفیا غالب آ گئے۔ یہاں تک کہ اب برائے نام علما جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں، ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علما کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولینا اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہم[۱] نے اسلامی سیرت کے احیا کی کوشش کی مگر صوفیا کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں، زیادہ کیا عرض کروں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

آپ کا خادم، محمد اقبال

۱- مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی (۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء - ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء)، عالمگیر اورنگزیب (۱۶۱۸ء-۱۷۰۷ء)
شاہ اسمٰعیل شہید (شہادت ۶ مئی ۱۸۳۱ء بالاکوٹ)

لاہور

۲۷ر جنوری ۱۹۲۶ء

مخدومی! السلام علیکم۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ انشاءاللہ اختلافِ رائے کا اثر پرائیویٹ تعلقات پر نہ ہوگا۔ میں نے تو صرف ایک دو خط شائع کئے تھے اور وہ بھی اُس وقت جب (خواجہ حسن نظامی) نے خود مضامین لکھے اور اپنے احباب سے لکھوائے۔ اُن مضامین کی مجھے کوئی شکایت نہیں شکوہ صرف اس امر کا تھا کہ پرائیویٹ خطوں میں تو وہ مجھے لکھتے تھے اور لکھتے ہیں کہ تمہاری نیت پر کوئی حملہ نہیں، لیکن اخباروں میں اس کے برعکس لکھتے ہیں۔ مَیں نے خود (خواجہ صاحب) سے اس امر کی شکایت کی تھی اور نہایت صاف باطنی کے ساتھ لکھا تھا کہ آپ میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔ علمی بحث ہونی چاہیئے حریف کو بدنام کرنا مقصود نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کو قائل کرنا اور راہِ راست پر لانا۔

بہرحال وہ معذور ہیں اور صوفی ضرور ہیں، مگر تصوّف کی تاریخ و ادبیات و علوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے۔ اس واسطے مجھے اُن کے مضامین کا مطلق اندیشہ نہیں ہے۔

علامہ ابن جوزیؒ[1] نے جو کچھ تصوّف پر لکھا ہے اس کو شائع کر دینے کا قصد ہے۔ اس کے ساتھ تصوّف کی تاریخ پر ایک مفصّل دیباچہ لکھوں گا انشاءاللہ اس کا مصالحہ جمع کر لیا ہے۔ منصور حلاّج[2] کا رسالہ "کتاب الطواسین"

۱۔ ابن جوزی، عبدالرحمٰن بن علی (۵۱۰ھ — ۵۹۷ھ)

۲۔ حلاّج منصور (۲۴۴ھ — ۳۰۹ھ) وحدت الوجودی، حلول کا قائل تھا۔

فرانس میں مع نہایت مفید حواشی کے شائع ہو گیا ہے۔ دیباچے میں اس کتاب کو استعمال کروں گا۔ فرانسیسی مستشرق[1] نے نہایت عمدہ حواشی دیئے ہیں۔ رہبانیت کے متعلق جو آیہ شریفہ آپ کے خیال میں ہو، ضرور لکھیئے

وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

نہایت خوب ہے۔ سیدھے، آسان اور مختصر الفاظ میں حقائق بیان کرنا آپ کا کمال ہے۔ عبدالماجد صاحب نے جو شعر آپ کا پسند کیا، نہایت خوب ہے، میں نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر لکھا تھا:

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

خادم، محمد اقبال

لاہور

۱۴ فروری ۱۹۱۶ء

مخدوم و مکرم حضرت مولینا! السلام علیکم۔

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ میں تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھ رہا ہوں جو ممکن ہے ایک کتاب بن جائے۔ چونکہ خواجہ حسن نظامی نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیائے کرام سے بدظن ہوں۔ اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کرنی ضروری ہے ورنہ اس طویل مضمون کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

چونکہ میں نے خواجہ حافظ پر اعتراض کیا ہے، اس واسطے اُن کا خیال ہے،

۱۔ ماسینیوں (۱۸۸۳ء-۱۹۶۲ء)

میں تحریکِ تصوّف کو دُنیا سے مٹانا چاہتا ہُوں۔ "سِرِّ اسرارِ خودی" کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون خطیب میں لکھا ہے جو آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ جو پانچ وجُوہ اُنہوں نے مثنوی سے اختلاف کرنے کے لکھے ہیں، انہیں ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ تاریخ تصوّف سے فارغ ہو لوں تو تقویۃ الایمان کی طرف توجہ کروں۔ فی الحال جو فرصت ملتی ہے وہ اسی مضمون کی نذر ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ ضروری کُتب لاہور کے کُتب خانوں میں نہیں ملتیں۔ جہاں تک ہو سکا میں نے تلاش کی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اس مضمون کو پڑھ کر خوش ہوں گے۔ منصور حلاّج کا رسالہ کتاب الطواسین نام فرانس میں شائع ہو گیا ہے، وہ بھی منگوایا ہے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ فی الحال مثنوی کا دُوسرا حِصّہ بھی ملتوی ہے۔ مگر اس میں عالمگیر اورنگزیب کے متعلق جو اشعار لکھے ہیں اُن میں سے ایک عرض کرتا ہُوں:

درمیانِ کارزارِ کُفر و دیں
ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

آپ کا قطعہ "حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن" بہت خوب رہا۔ صرف ایک بات ہے کہ خواجہ صاحب کو تو کبھی رقص اور سُکر نصیب ہوتا ہوگا، میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ والسلام۔

آپ کا خادم: محمد اقبال

لاہور

۱۱ر جون ۱۹۱۸ء

مخدومی! تسلیمات۔

کل ایک خط ڈاک میں ڈال چکا ہوں آج اور کل دو اور خط آپ کے موصول ہوئے۔

میں نے خواجہ حافظ رح پر کبھی یہ الزام نہیں لگایا کہ اُن کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظ رح پر بالکل اور نوعیّت کا ہے۔ اسرارِ خودی میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے۔ اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا۔ اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ خواجہ حافظ رح کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا نہ اُن کی شخصیت سے۔ نہ اُن اشعار میں "مے" سے مُراد وہ "مے" ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں۔ بلکہ اس سے وہ حالتِ سُکر (NACOTIC) مرُاد ہے جو حافظ رح کے کلام سے بحیثیّتِ مجموعی پیدا ہوتی ہے۔

چُونکہ حافظ رح ولی اور عارف تصّور کئے گئے ہیں اس واسطے اُن کی شاعرانہ حیثیّت عوام نے بالکل ہی نظر انداز کر دی ہے اور میرے ریمارک تصوّف اور ولایت پر حملہ کرنے کے مرادف سمجھے گئے۔ (خواجہ حسن نظامی) نے ایسا سمجھ کر اخباروں میں لکھا، اس واسطے مجھے مجبوراً تصوّف پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا پڑا۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کون تصوّف میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ نئی بات نہیں۔ حضرت علاؤالدولہ[1] سنجانی لکھ چکے ہیں حضرت جُنید[2] بغدادی لکھ چکے ہیں، میں نے تو محی الدین[3] اور منصور حلاّج کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سنجانی رح اور جُنید رح نے ان دونوں بُزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ ہاں ان کے عقائد اور خیالات سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے۔

۱۔ علاؤ الدولہ سنجانی (سمنانی) آٹھویں صدی ہجری کے صوفی بزرگ۔

۲۔ جُنید بغدادی رح (وفات ۲۹۷ھ) مسلمان صوفی بزرگ۔

۳۔ محی الدین ابن العربی (۵۶۰ھ - ۶۳۸ھ) وحدت الوجودی فلسفی۔

اگر اسی کا نام مادیت ہے تو قسم بخدائے لایزال، مجھ سے بڑھ کر مادہ پرست دُنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ معاف کیجئے گا، مجھے آپ کے خطوط سے معلوم ہوا ہے (ممکن ہے غلطی پر ہوں) کہ آپ نے مثنوی اسرارِ خودی کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظ رح کے متعلق لکھے گئے تھے۔ باقی اشعار پر نظر شاید نہیں فرمائی۔ کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی کہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔

عجمی تصوّف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حُسن و چمک پیدا ہوتا ہے۔ مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوف دِل میں قوّت پیدا کرتا ہے اور اس قوّت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔

میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مُسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالکِ اسلامیہ میں قابلِ اصلاح ہے۔ PESSIMISTIC LITERATURE کبھی زندہ نہیں رہ سکا قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کے لٹریچر کا OPTIMISTIC ہونا ضروری ہے۔ اسرارِ خودی میں حافظ رح پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں، جن کا عنوان یہ ہے:

"در حقیقتِ شعر و اِصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ"

ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ آپکی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی اور میرا اصل مطلب واضح ہو جائے گا۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

پنڈت کشوری لعل سے بہت عرصہ ہوا ملاقات ہُوئی تھی۔ معلوم نہیں وہ آجکل کہاں ہیں۔ کعبہ و کاشی کے سوا کوئی اور مقام بھی ہوگا مگر خُدارا آج کل صرف کعبہ ہی بتائیے۔ ورنہ مُسلمانوں کی جمعیّت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس وقت اسلام کا دُشمن سائنس نہیں (جیسا کہ بعض لوگ نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں۔ اسلام کی

پوزیشن سائنس کے خلاف نہایت مضبوط ہے) مگر اس کا دشمن یورپ کا TERRITORIAL NATIONALISM ہے جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اُکسایا، مصر میں "مصر مصریوں کے لئے" کی آواز بلند کی اور ہندوستان کو PAN INDIAN Democracy کا بے معنی خواب دکھایا۔ آپ تو گروہ بندی پر بڑا زور دیتے ہیں بلکہ ایک جگہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے "مذہب کیا ہے گروہ بندی ہے فقط" گو مجھے اس مصرع سے اتفاق نہیں تاہم مذہب اسلام کا ایک نہایت ضروری پہلو قومیت ہے جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے۔ اگر آپ کے نزدیک مذہب کا مقصد صرف گروہ بندی ہے اور کچھ نہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا مصرع سے معلوم ہوتا ہے تو آپ کے قلم و زبان سے یہ بات زیب نہیں دیتی کہ کعبہ و کاشی کے سوا کوئی اور مقام بھی ہے۔ آپ کے نزدیک تو کعبہ کے سوا کوئی اور مقام نہ ہونا چاہیئے۔ یہی میرا بھی مذہب ہے۔

خیریت مزاج سے آگاہ کیجئے۔

مخلص، محمد اقبال۔ لاہور

لاہور

۲۰ر جولائی ۱۹۱۸ء

مخدومی! نوازش نامہ کل ملا تھا۔ اس سے پیشتر ایک پوسٹ کارڈ بھی ملا تھا۔ آپ مجھے تناقض کا ملزم گردانتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں بلکہ میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرارِ خودی کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں نے کسی گذشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لئے میری خاطر اسے ایک دفعہ پڑھ لیجئے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا:-

آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو!

اور اسرارِ خودی میں کوئی تناقض نہیں۔

یہ بات تو میں نے پہلے حصّے میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر بیان کی ہے:

اندکے اندر سرائے دِل نشیں

ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو سوئے خود گام زن

لات و عزائے ہوس را سر شکن

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد

فارغ از بندِ زن و اولاد شد (اسرارِ خودی)

میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچّی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا، اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے:

بندۂ حق پیشِ مولا لاستے

پیشِ باطل از نعم بر جاستے

دُوسرے حصّے میں عالمگیرؒ کی ایک حکایت ہے۔ اس میں یہ شعر ہے:

ایں چُنیں دِل خُود نما و خُود شکن

دارد اندر سینۂ مومن وطن

مگر ایک اور بیخودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ جو LYRIC POETRY کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔

۱۔ اسرارِ خودی: صرا ۲۳

(۲) دُوسری وہ بیخودی ہے جو بعض صوفیہ اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے، نہ احکامِ باری تعالےٰ میں۔

پہلی قسم کی بیخودی تو ایک حد تک مُفید بھی ہو سکتی ہے مگر دُوسری قسم تمام مذہب و اخلاق کے خلاف، جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دو قسموں کی بیخودی پر معترض ہوں اور بس۔ حقیقی اسلامی بیخودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیّلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ اس طرح پر کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوّف کے نزدیک "فنا" ہے۔ البتّہ عجمی تصوّف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے جس کا ذکر اُوپر کر چکا ہوں۔ خواجہ حافظ رح پر جو اشعار مَیں نے لکھے تھے اُن کے مقاصد کچھ اور تھے۔ آیاتِ قرآنی جو آپ نے لکھی ہیں، زیرِ نظر ہیں۔ مَیں ان کے وہی معانی سمجھتا ہوں جو آپ کے ذہن میں ہیں۔ حیاتِ دُنیا بے شک لہو لعب ہے۔ مَیں نے بھی پہلے حصّہ میں (اسرارِ خودی) یہی لکھا ہے:۔

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خُدا اندیش زی

پھر دُوسرے حصّے میں ہے جس میں حضرت عمر رض کا ایک قول منظوم کیا ہے:

راہ دُشوار است ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی، آزاد میر
سُبحۂ اَقلِل مِنَ الدُّنیا شمار
از تعش حُرّاً شَوی سرمایہ دار

غرض یہ ہے کہ سلطنت ہو، امارت ہو، کچھ ہو، بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ یہ ذرائع ہیں اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے۔ جو شخص ان کو بجائے خود مقصد جانتا ہے وہ رَضُوا بِالحَیٰوۃِ الدُّنیَا میں داخل ہے۔ کوئی فعل مسلمان کا ایسا نہ ہونا چاہئے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہو۔ مسلمان کی تعریف پہلے حصے میں یوں کی گئی ہے[۱] (اسرارِ خودی) :

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دِہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دِہ
طبعِ مسلم از محبّت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است
تابعِ حق دیدنش، نادیدنش
خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش
در خیالش مرضیِ حق گم شود
"ایں سخن کے باورِ مردم شود"

زیادہ کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ مجھ پر عنایت فرمائیے، عنایت کیا رحم کیجئے اور اسرارِ خودی کو ایک دفعہ پڑھ جائیے جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اُس کی تکلیف سے اُس نے آہ و فریاد کی، اسی طرح مجھ کو آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے، والسلام۔

مخلص، محمد اقبال

۱۔ اسرارِ خودی : در رضائیش (ص۲۷)

لاہور

۲۵ر جولائی ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم۔ والا نامہ کل ملا تھا۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے گرمی کی یہاں بھی شدّت ہے۔ برسات اب کے خالی جاتی معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا خط مجھے بھی آیا تھا اور میرا قصد بھی فاتحہ جناب امیر میں شریک ہونے کا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ میری بیوی کچھ عرصہ سے بیمار ہے اور ابھی تک روبصحت کامل طور پر نہیں ہوئیں۔ خواجہ صاحب کو بھی میں نے یہی لکھا تھا کہ وہ اچھی ہو گئیں تو حاضر ہوں گا۔ اگر اب نہ جا سکا تو تعطیلوں میں انشاءاللہ دہلی جانے کا قصد ہے کہ ایک مدّت سے آستانۂ حضرت محبوب الٰہی پر حاضر ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں کیا عجب کہ ان گرما کی تعطیلوں میں اللہ اس ارادے کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے خواجہ حسن نظامی سے مجھے دلی محبت ہے جس پر اختلافِ خیال قطعاً کوئی اثر نہیں کر سکتا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اختلاف بھی کم از کم میرے علم اور سمجھ کے مطابق کوئی ایسا اختلاف نہیں۔ وہ کچھ عرصہ ہوا یہاں تشریف لائے تھے۔ مَیں نے اصرار کیا کہ وہ ایک روز قیام فرمائیں لیکن وہ ٹھہر نہ سکتے تھے۔ زبانی باتیں ہوتیں تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں لیکن جو کچھ بھی ہو اس سے اُس محبّت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی جو مجھ کو اُن سے ہے۔ وہ ایک نہایت محبوب آدمی ہیں۔ اُن کو جان کر اُن سے محبّت نہ رکھنا ممکن نہیں۔

ع "غم بڑا مدرکِ حقائق ہے"

اِس مصرع کی پہلے بھی داد دے چکا ہوں۔ - - - - - - - اس سادگی اور بے تکلّفی سے منظوم ہوتے ہیں کہ شیکسپیئر اور مولینا روم یاد آ جاتے ہیں۔ آپ کے اس شعر "جہاں ہستی ہوئی محدود... الخ" پر ریویو کرتے ہوئے میں نے کسی

انگریزی فلسفے کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ خیالات و افکار بھی آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ کل مثنوی مولینا روم دیکھ رہا تھا کہ یہ شعر نظر پڑا:

ہر خیالے را خیالے مے خورد — فکر ہم بر فکرِ دیگر مے چرد

سبحان اللہ! ایک خاص باب میں انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ باری تعالےٰ کے سوا ہر ہستی آکل و ماکول ہے اور اس ضمن میں شوپن ہار[1] (فلاسفر جرمنی) کے فلسفے کو اس خوبی سے نظم کر گئے ہیں کہ خود شوپن ہار کی رُوح پھڑک گئی ہوگی۔

کل شام ایک محفل میں آپ کے شعر:

دل اُس کے ساتھ ہے خدا جس کے ساتھ ہے، الخ

پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اگرچہ یہ شعر مشاعرے میں پڑھا نہیں گیا، تاہم تمام شہر میں مشہور ہے۔

میں خاکِ راہ .... کر ہوا کے ساتھ

پر آج گفتگو رہے گی۔ یہ شعر بھی حقائق سے خالی نہیں۔ ایک فارسی رُباعی ہوگئی تھی عرض کرتا ہوں:

گل گفت کہ عیشِ نو بہارے خوشتر — یک صبح چمن ز روزگارے خوشتر
زاں پیش کہ کس ترا بدستار زند — مُردن بکنارِ شاخسارے خوشتر

زیادہ التماس دعا۔

مخلص، محمد اقبال

سیالکوٹ

۱۳؍ اگست ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم۔ والانامہ لاہور سے ہوتا ہوا ملا۔ الحمد للہ کہ جناب کا

۱۔ شوپن ہار (۱۷۸۸ء-۱۸۶۰ء)

مزاج بخیر ہے۔ واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف۔ اسی واسطے جب کبھی موقع ملتا ہے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے اُن کی گرمئ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔

پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے "معلوم نہیں، بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے" اس خیال سے اس قدر متأثر ہوئے کہ قریباً بیہوش ہو گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی۔ یہ خاموش لیکچر ہیں جو پیرانِ مشرق سے ہی مل سکتے ہیں۔ یورپ کی درسگاہوں میں ان کا نشان نہیں۔ اگست کے آخر تک انشاءاللہ یہیں قیام رہے گا۔

. . . . . نے اگر کچھ لکھا ہے تو اس کا بہترین جواب خاموشی ہے تردید کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ پرچہ قدیم اسلامی شعار کو بنگاہِ حقارت دیکھتا ہے۔ گو ابھی صاف صاف لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

میں نے سنا ہے کہ سید عبدالرؤف لاہور تشریف لائے تھے اور چیف جج صاحب سے بھی ملے تھے۔ گورنمنٹ میں نام ضرور پیش ہے اور بعض حکام مائل بھی ہیں، مگر مجھے باوجود ان سب باتوں کے اُمید نہیں۔ اسی واسطے اس موقع پر میں کسی سے نہیں ملا اور میرے بعض احباب مجھ سے ناراض ہیں کہ شملہ جانے کی جگہ سیالکوٹ آ گیا ہوں۔ مگر میں اُن احباب کو معذور جانتا ہوں کہ وہ میری قلبی کیفیات سے آگاہ نہیں ہیں۔ بہرحال جو کچھ علمِ الٰہی میں ہے ہو جائے گا اور وہی انسب و اولیٰ ہو گا۔

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ خیریت سے آگاہ کیجئے۔ کل شام سے طبیعت نہایت مشتعل ہے۔ وکیل اخبار لکھتا ہے کہ کسی انگریزی اخبار نے مدینہ منورہ کی بہت توہین کی ہے۔ کمزوروں کے پاس سوائے بددعا کے اور کیا ہے۔

والدِ مکرّم سلام شوق عرض کرتے ہیں۔

مخلص، محمد اقبال

لاہور

۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم۔

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ ابھی تو مسلمانوں کو اردو کے لٹریچر کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپکو عمرِ خضر عطا فرمائے۔

مَیں ۹ ستمبر کو لاہور واپس آگیا تھا مگر ترشی کے زیادہ استعمال سے مانت میں سخت درد ہو گیا۔ جس نے کئی روز تک بے قرار رکھا۔ اب خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہوں۔ رسالہ "الیسٹ اینڈ ویسٹ" (انگریزی) کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمان[۱] صاحب نے ایک ریویو دونوں مثنویوں پر لکھا ہے۔ نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کی کوئی کاپی مل گئی تو ارسالِ خدمت کروں گا۔ آج "زمانہ" میں ایک ریویو نظر سے گذرا۔ زمانے کے اسی نمبر میں آپ کے اشعار بھی دیکھے جن کو کئی دفعہ پڑھا ہے اور ابھی کئی بار پڑھوں گا۔ بالخصوص اس شعر نے:

جب علم ہی عاشقِ دُنیا ہوا، الخ

بہت اثر دل پر کیا۔ مگر اس شعر کو:

یہ صلح کل فقیری، نفتر یا شاہی لطیفہ ہے،

آپ کے اشعار میں دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ یہ کس کا شعر ہے؟ شاہی لطیفہ کی داد دینا میرے قلم کے امکان سے باہر ہے۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (وفات ۱۹۱۸ء)

ایک نہایت مخلص نوجوان یہاں لاہور میں ہے، تاجر کُتب ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ شکوہ اور جواب شکوہ کو پھر شائع کرنا چاہیئے مگر مولانا اکبر دیباچہ لکھیں۔ مَیں نے آپ کی طرف سے ہر چند عذر کیا مگر وہ مُصر ہے۔ آخر مَیں نے اُس سے وعدہ کیا کہ مولانا کی خدمت میں عرض کروں گا۔ ایسی فرمائش کرتے ہوئے حجاب آتا ہے کہ مجھے آپ کے ضعف و ناتوانی کا حال معلوم ہے۔ تاہم اگر کسی روز طبیعت شگفتہ ہو اور آلام و افکار کا احساس شگفتگیِ طبع سے کم ہو گیا ہو تو دس پندرہ سطور اس کی خاطر لکھ ڈالیے۔ یہ لڑکا آپکا غائبانہ مُرید ہے۔

کلکتہ کے فساد کے حالات اخبار میں پڑھے تھے۔ آج مزید حالات پڑھے، خدا تعالیٰ مُسلمانوں پر فضل کرے اور اُن کے لیڈروں کو آنکھیں عطا فرمائے کہ وہ اس زمانے کے میلانِ طبیعت کو دیکھیں۔ مجھے بھی کلکتہ سے بُلاوا آیا تھا اور مَیں جانے کو قریباً تیار بھی تھا۔ مگر جب مطبوعہ خط کا مضمون والدِ مکرم کو سُنایا تو اُنہوں نے فرمایا کہ حُکّام غالباً یہ جلسہ بند کر دیں گے۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل
بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیئے

مخلص: محمد اقبال

لاہور

۲۸ / اکتوبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم۔

نوازش نامہ دو تین روز ہوئے موصول ہوا۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ لاہور میں وبائے انفلوئنزا کی بہت شدت ہے۔ یہاں تک کہ گورکن میسّر نہیں آتے۔ دوا سے بھی اس مرض کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو معلوم ہی نہیں کہ اس کا علاج کیا ہے۔

دُوسرا دوا موجود نہیں اور ڈاکٹر خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ پنجاب میں اس وقت اس کا حملہ نہایت شدید ہے۔ لاہور میں قریباً ڈھائی سو اموات روزانہ ہیں اور ابھی کمی کے کوئی آثار نہیں۔ امرتسر میں بھی یہی کیفیت ہے اُمید کہ الٰہ آباد میں خیریت ہوگی۔ مسلمانوں پر خصوصیت سے زیادہ نظرِ عنایت ہے۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم فرمائے۔

'زمانے' میں ریویو دیکھا تھا۔ خیر اچھا ریویو تھا۔ مگر آپ کی شاعری پر ریویو لکھنے کا حق آج تک کوئی دُوسرا ادا نہیں کر سکا۔ 'زمانے' نے جو اشعار انتخاب کئے، وہ دو چار روز ہوئے بار بار روم میں مزے لے لے کر پڑھے گئے۔ وقت کی مصلحت نہیں، ورنہ آپ کے اشعار پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتا اور زندگی رہی تو انشاء اللہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ مطلع آپ کا لاجواب ہے:

کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے

سُبحان اللہ و الیہ المصیر،

معارف میں کسی ہندو شاعر کا شعر نظر سے گزرا:

لبکہ از شرم تو در پرواز رنگِ گلشن است
رشتۂ نظارہ بند در ہوا گلدستہ را'

اور کچھ عرصہ ہوا اخبار الخلیل میں کسی نے ایک نہایت عُمدہ شعر لکھا تھا:

شب چہ اندازِ ہم آغوشی، او یاد کنم
خویش را تنگ بہ بر گیرم و فریاد کنم

للّٰہ درمن قال

زیادہ کیا عرض کروں اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص: محمد اقبال

لاہور

۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء

مخدومی! السلام علیکم،

نوازش نامہ مل گیا اور اس سے پیشتر بھی ایک خط ملا تھا۔ جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی جس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل معمول سے زیادہ مصروفیت ہے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر ہیگ چیچک کی بیماری سے دفعتاً انتقال کر گئے اور انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لئے کالج کے ایم۔اے کی جماعت مجھ کو لینی پڑی۔ اُمید ہے دو ماہ تک نیا پروفیسر مل جائے گا یہ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آ جاتے ہیں۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے اس میں اُن کے لیکچر کے لئے کُتب دیکھتا ہوں۔ لیکچر کیا ہیں "انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عُرفِ عام میں تاریخِ فلسفہ کہتے ہیں۔

ابھی کل شام ہی مَیں اُن کو آپ کا یہ شعر سُنا رہا تھا:

مَیں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو مِلا ہے تُل کر نظر بھی مجھ کو مِلی ہے نپ کے

سُبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ!

بہر حال اللہ لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے:

جان حاضر ہے مگر راہِ خدا ملتی نہیں

میں آپ کا مقصود خوب سمجھتا ہوں۔ سیدھے سادے الفاظ میں حقائق بیان کر دینا آپ کا خاص حصّہ ہے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آپ کی رباعی:

اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

بہت عرصہ سے میں نے نوٹ کر رکھی ہے۔

بہت عرصہ سے کوئی شعر نہیں لکھا۔ مثنوی کا تیسرا حصّہ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ دو شعر یاد آئے ہیں جو دو تین ماہ ہوئے لکھے تھے۔ عرض کرتا ہوں:

در جہاں مانندِ جُوئے کوہسار
از نشیب و ہم فراز آگاہ شو
یا مثالِ سیلِ بے زنہار خیز
فارغ از پست و بلند راہ شو

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ بال بچّے سب یہیں ہیں اور الحمدللہ خیریت سے ہیں۔ آج ۲۸ر نومبر ہے۔ فتح کی خوشی میں بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔ شاید شام کو میں بھی اس جلسے میں جاؤں۔ والسلام، اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص: محمد اقبال، لاہور

لاہور

۲۰ر اپریل ۱۹۱۹ء

مخدومی! السلام علیکم،

والا نامہ مل گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور خط آپ کا ملا۔ اس وقت تک خدا کے فضل و کرم سے ہر طرح خیریت ہے۔ امید کہ آنجناب بخیر و عافیت ہوں گے لاہور کے حالات آپ نے اخباروں میں دیکھے ہوں گے۔ گاندھی صاحب کا خاموش مقابلہ یہاں تک رنگ لایا ہے کہ حکّام لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات میں مارشل لاء (آئینِ عسکری) کے اجرا پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے۔ عجب زمانہ آرہا ہے۔

زچہا گذشتہ باشی بچہار سیدہ باشی

ٹھیک ہے، جو شخص

زجہاں گذشتہ باشی بہمالا رسیدہ باشی

پڑھتا ہے، وہ زبان اور شعر دونوں کے ذوق سے معرّا ہے۔

آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مگر یہ زمانہ گھر سے باہر نکلنے کا نہیں۔
اللہ تعالیٰ اس ملک کے لوگوں کی حالت پر رحم کرے:

مومن کو چاہیئے کہ خدا ہی کا ہو رہے

چند روز ہوئے ایک مصرع ذہن میں آیا تھا۔ دوسرا مصرع نہیں ہو سکا:

ایں سرِ خلیلؑ است با آذر نتواں گفت

غور فرمائیے، کچھ ذہن میں آئے تو مطلع کیجئے۔ خواجہ صاحب کا خط بھی آج
آیا ہے۔ وہ خیریت سے ہیں۔

مخلص محمد اقبال، لاہور

باب سوم

خطوط اکبرؒ بسلسلہ اقبالؒ

(۱) اقبال بنام عشرت

اکبر الہ آبادی کے انتقال پر اقبال نے اکبر کے صاحبزادے سید عشرت حسین کو تعزیت کا تار دیا اور خط لکھا۔ تار کا متن یہ تھا۔

HERTFELT SYMPATHY. INDIA LOSES A GREAT PERSONALITY

IQBAL.

خط درج ذیل ہے:

لاہور

۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء

مخدومی، السلام علیکم

ابھی "زمیندار" سے آپ کے والد بزرگوار (اور میرے مرشد معنوی) کے انتقال پُر ملال

کی خبر معلوم ہوئی۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ان سے آخری ملاقات نہ ہو سکی۔ میں اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو ان کی زیارت کے لئے الٰہ آباد کا سفر کریں۔ انہوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا تھا کہ امسال ضرور ملنا، بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں۔ میری بدنصیبی ہے کہ میں ان کے آخری دیدار سے محروم رہا، ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔

اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے، جب جا کے ایک اکبر اسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بد قسمت ملک اور اس کی بد قسمت قوم کے لئے کچھ عرصے اور جاری رہتا۔

خدا تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میں نے ابھی ایک تار بھی آپ کو دیا ہے۔

مخلص، محمد اقبال

(۲) اقبال بنام شاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد، شاد

ریاست حیدرآباد کے پیشکار و مدار المہام (۱۳۱۰ھ - ۱۳۳۰ھ، ۱۳۴۵ھ — ۱۳۵۶ھ) ولادت ۱۸۶۴ء، وفات ۱۹۴۰ء، امیرانہ ماحول میں رہنے کے باوجود درویشانہ عادات، وسیع المشرب مشرقی، اسلامی تمدن کا آخری نمونہ، شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ ہندو مسلم سب سے رواداری اور فیاضی کا سلوک کرتے، مشاہیر ہند سے تعلقات تھے۔ اکبر اور اقبال سے بھی مراسلت تھی،

یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء

"میں ستمبر کا قریباً کل مہینہ لاہور سے باہر رہا۔ پہلے کانپور مسجد کے مقدمے کے لئے گیا، وہاں سے دہلی آیا اور حاذق الملک کے ہاں بغرض علاج مقیم رہا، الہ آباد بھی گیا، وہاں دو روز مولانا اکبر کی خدمت میں رہا۔ آپ کا ذکر خیر آتا رہا۔" (صحیفہ اقبال نمبر ص۱۰۱)

یکم مارچ ۱۹۱۴ء

"مولانا اکبر کا خط کل آیا تھا، خیریت سے ہیں۔ ان کا دم بھی غنیمت ہے۔ خدا انہیں خوش رکھے میں نے ان کے رنگ میں چند اشعار لکھے تھے، مگر وہ بات کہاں؟ دو شعر عرض کرتا ہوں:

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
"پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے"

(صحیفہ، اقبال نمبر ص۱۱۵)

۹ ستمبر ۱۹۱۵ء

"کل کسی ایرانی کا ایک شعر سرخوش کے "کلمات الشعرا" میں نظر سے گزرا۔ مولانا اکبر کو ابھی خط لکھا ہے اور اُن کو بھی اس شعر کی لذت یا دکھ میں شریک کیا ہے۔ آپ بھی شریک ہو جائیں:

کشیدہ ام ز جنون ساغرے کہ ہوش نماند
دگر معاملہ با پیر مے فروش نماند"

(صحیفہ، اقبال نمبر ۱۵۲)

۳۰ ستمبر ۱۹۱۵ء

"میرزا سلطان احمد خاں بہادر، جو پنجاب کے مشہور مبصر اور اہل قلم ہیں، اس پر ریویو کر رہے ہیں آپ کا ریویو مثنوی (اسرار خودی) کو چار چاند لگا دے گا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر عزت اور

اور کیا ہوگی۔ آپ نے اور مولانا اکبر نے اسے پسند فرمایا، بس یہی داد میرے لئے کافی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی"

(صحیفہ، اقبال نمبر صہ ۱۵۳)

۳۰ جنوری ۱۹۱۶ء

"مولانا اکبر کا خط آیا تھا۔ ایک شعر اس خط میں لکھتے ہیں، نہایت مزے کا مطلع ہے:

مرنے والا مرچکا اور رونے والا رو چکا
وائے بر ہستی اگر مقصودِ ہستی ہو چکا

(صحیفہ، اقبال نمبر صہ ۱۶۱)

۲۸ مئی ۱۹۱۶ء

لاہور میں گرمی کا زور ہے اور اس پر مس گوہر جان کا نغمۂ جگر سوز فضائے لاہور کی حدت پر مستزاد ہے۔ مولانا اکبر نے خوب ارشاد فرمایا تھا:

نصیب ایسا کہ رکھتی ہے زر و سیم و گہر گوہر (۱)
میسر ہے اسے ہر چیز دنیا میں، مگر شوہر"

(صحیفہ، اقبال نمبر صہ ۱۶۱)

۱۹ مئی ۱۹۱۷ء

"کل مولانا اکبر کا خط آیا تھا۔ اس خط میں ایک لطیف مطلع انہوں نے لکھا ہے:

زباں سے قلب پر صوفی خدا کا نام لایا ہے

---

(۱) اسی گوہر جان کلکتہ والی کے بارے میں اکبر کا دوسرا مشہور شعر ہے:

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

یہی مسلک ہے جس میں فلسفہ اسلام لایا ہے"

(اقبالنامہ حصہ دوم، ص ۱۸۶)

۱۵ دسمبر ۱۹۱۹ء

"مولانا اکبر آج کل دہلی کے حجرۂ رین بسیرا (خواجہ حسن نظامی کا مسکن) میں مقیم ہیں۔ انشاء اللہ ۲۲ دسمبر کو میں بھی ان کی زیارت کے لئے دہلی جاؤں گا۔ دھوم دھام کے جلسے ہیں یعنی کانگرس اور لیگ کا ... ریسپشن کمیٹی کی صدارت کے لئے مجھ سے کہا گیا ہے لیکن معذرت رہتا ہوں اس کے علاوہ مولانا اکبر کی کشش دہلی کھینچ رہی ہے:

بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

(اقبالنامہ، حصہ دوم، ص ۲۰)

(۳) اقبال بنام گرامی

مولانا غلام قادر گرامی

ولادت: (۱۸۵۷ء سے چند برس قبل) وفات: ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء (عمر تقریباً ۷۵ اور ۸۰ کے درمیان) فارسی کے قادر الکلام شاعر۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ مکتب کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کر کے اورینٹل کالج لاہور میں منشی فاضل کیا۔ معلمی کے پیشے سے آغاز کر کے حیدر آباد میں ملک الشعرا ہوئے۔ طویل ریاستی ملازمت کے بعد ۱۹۱۷ء میں سبکدوش ہوئے اور بقیہ زندگی ہوشیار پور میں گذاری۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود اقبال گرامی کے مراسم نہایت درجہ بے تکلفانہ تھے۔ (گرامی کے نام اقبال کے خطوط میں اکبر کا تذکرہ مکاتیبِ اقبال بنام گرامی سے ماخوذ ہے)

(تاریخ ندارد ـــ ؟)

"مولانا اکبر الہ آبادی کا کیا خوب شعر ہے:

گفت ہاشم بے سبب زانگش مرا اکراہ نیست
ہر کتابے راکہ بکشادیم بسم اللہ نیست

ہاشم ان کے لڑکے کا نام ہے۔" (صفحہ ۹۳)

۲۸ جنوری ۱۹۱۵ء

"زدیدہ تا در دل ذرہ ذرہ غماز است" میں نے یہ شعر مولانا اکبر کو الہ آباد لکھ کر بھیجا تھا کل ان کا خط آیا۔ اس شعر نے انہیں بھی تڑپا دیا۔ غرضیکہ گرامی معجز نگار ہندوستان کے لیے سرمایہ ناز ہے اور آج ایران میں بھی ایسا سحر طراز نہ ہوگا زندہ باش اے پیر کہن!" (صفحہ ۱۰۱)

۲ دسمبر ۱۹۱۸ء

والانامہ مل گیا۔ غزل کیا ہے دفتر معرفت ہے۔ یہ غزل (۱) کئی دفعہ آپ سے سن کر مزے لے چکا ہوں آج قند مکرر کا مزہ دے گئی۔ ابھی اس کے دو شعر مولانا اکبر کو لکھے ہیں کہ تنہا خوری نہ ہو۔

۱۶ ستمبر ۱۹۲۱ء

"ڈیر گرامی، السلام علیکم!

آخر ما حبیب تمنا تہی!

اس مصرع نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ اکبر مرحوم کے انتقال سے پہلے ہی میری طبیعت افسردہ ہو رہی تھی۔ اس مصرع نے نشتر کا کام کیا، دل تو چاہتا تھا کہ . . . . اکبر مرحوم بے نظیر آدمی

---

(۱) گرامی کی غزل کا مطلع اور وہ شعر جس کا اقبال نے خاص طور پر خط میں ذکر کیا ہے، یہ ہیں: صفحہ ۱۰۵

پنہانم و پیدایم کیفم بشراب اندر
پیدایم و پنہانم دائم بکباب اندر
رمزیست حکیمانہ می خوانم و می رقصم
خوابست بمرگ اندر مرگ است بخواب اندر

تھے وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے۔ مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیات میں کم بلند نہ تھا۔ اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی۔ یوں تو کئی سالوں سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی رفیق اعلیٰ سے ملنے کے لئے ایک تڑپ تھی مگر گزشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے۔ کوئی خط ایسا مشکل سے ہوگا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو۔

ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے، زندگی سے محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروس حیات سے ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے اور اختلاط کا نتیجہ انس ہے۔

بہرحال وجہ خواہ کچھ بھی ہو، میں نے یہ کلیہ صوفی اکبر مرحوم کی صورت میں صحیح نہ پایا خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ مسلمانان ہند کو اپنے اس نقصان کا شاید پورا پورا احساس نہیں ہے"۔ (ص۱۶۷)

۲۲ جون ۱۹۲۲ء

"وہاں جب میں "پیغمبر" کا دعویٰ کروں گا تو آپ کو بیعت کے لئے بلاؤں گا۔ آج کل پیغمبری کا ادعا تو عام ہو چکا ہے، خدائی کا دعویٰ کرنا چاہئے۔ کیا خوب کہا مولانا اکبر مرحوم نے:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ"

(ص۲۱۷)

(۴) اقبال بنام نیاز

محمد نیاز الدین خان

بستی دانشمنداں جالندھر کے متمول زمیندار تھے۔ سب جج کے عہدے پر فائز رہے۔ شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ اقبال سے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان مراسلت رہی۔ ۹۷ خطوط کا مجموعہ "مکاتیبِ اقبال" کے نام سے بزم اقبال لاہور نے شائع کیا۔ یہ اقتباسات اسی مجموعے سے لیے

گئے ہیں:

۲۷ جون ۱۹۱۷ء

ہاں آموں پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ گذشتہ سال مولانا اکبر نے مجھے لنگڑا آم بھیجا تھا۔ میں نے پارسل کی رسید اس طرح لکھی:

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبر
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

(صہ ۹)

۹ مارچ ۱۹۱۸ء

"چند روز میں ایم۔ اے کا زبانی امتحان لینے کے لئے الٰہ آباد جانے والا ہوں اور یہ ممتحنی میں نے محض اس واسطے قبول کر لی کہ مولانا اکبر کی زیارت کا بہانہ ہو جائے گا۔" (صہ ۱۲)

۲۰ مارچ ۱۹۱۸ء

"میں الٰہ آباد جانے والا تھا مگر مولانا اکبر کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں پلیگ زوروں پر ہے والد مکرم نے جو چند روز ہوئے یہاں تھے یہ خط دیکھ کر مجھے الٰہ آباد جانے سے روک دیا۔" (صہ ۱۲)

۹ نومبر ۱۹۱۹ء

"۲۳ دسمبر کو دہلی جاؤں گا، وہاں سے ۲۵ یا ۲۶ کو واپس ہوتا ہوا ایک آدھ روز کے لئے آپ کی خدمت میں بھی ٹھہر جاؤں گا، بشرطیکہ صحت اچھی رہی۔ سردی کا سفر بہ سبب ضعفِ گردہ میرے لئے مضر ہوتا ہے۔ مولانا اکبر الٰہ آبادی دہلی میں ہیں اور آخر دسمبر تک قیام کریں گے۔ ان کی زیارت ضروری ہے اس کے لئے فقیر سید نجم الدین صاحب کے لڑکے کی شادی ہے، وہ اصرار کر رہے ہیں۔ اگر مولانا اکبر کی کشش نہ ہوتی تو فقیر صاحب سے معافی مانگ لیتا۔" (صہ ۲۵)

۱۹ دسمبر ۱۹۱۹ء

"۲۳ کی شام کو یہاں سے چلوں گا۔ واپسی پر انشاءاللہ ایک روز آپ کی خدمت میں قیام رہے گا اور مولوی گرامی صاحب سے بھی ملاقات ہوگی۔۔۔۔ مولانا اکبر تو غالباً ۲۳ سے پہلے ہی الہ آباد چلے جائیں گے۔ کیونکہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے میں نے بھی ان کی زحمت کے خیال سے زور نہیں دیا کہ وہ دہلی میں میری آمد تک قیام فرمائیں"۔ (ص۲۶)

۱۰ جون ۱۹۲۰ء

۲۷ جون ۱۹۱۷ء کا لطیفہ/ شعر لکھا گیا ہے) (ص۳۴)

۲۳ اپریل ۱۹۲۱ء

"مولانا اکبر کی تنقید میں نے بھی دیکھی ہے۔ ہمدم دیرینہ ہیں۔ اس واسطے مجھے یاد کر لیتے ہیں"۔ (ص۳۷)

باب چہارم

خطوطِ اکبرؔ بنام اقبالؔ

الٰہ آباد

۱۴؍ اکتوبر ۱۹۱۱ء

حبیبی و مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ، زعفران عطیہ جناب پہنچی۔ تہِ دل سے شکر گزار ہوں خانۂ احسان آباد۔ آپ نے تکلف فرمایا۔ میرا منشا یہ تھا کہ کسی معتبر تاجر کو آپ یا آپ کے کوئی دوست لکھ دیں کہ عمدہ زعفران کا ویلیو پے ایبل پارسل مجھ کو بھیج دے۔ خیر اس بات کی خوشی ہوئی کہ میرے روحانی دوست نے مجھ کو تحفہ عنایت فرمایا۔ اس خیال میں بڑی لذت ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میرے اسلامی بھائی نے تحفہ بھیجا۔ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے اور ان روزوں بڑے جھگڑے کی بات ہے۔ خدا قوم میں اخوتِ اسلامیہ پیدا کر دے۔ ایک صحابی سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ کا جسم مبارک مرقد میں اُتارا گیا اور ہم لوگوں نے اپنے دلوں کو الگ الگ پایا۔ آپ کی نظم سوز ہیں نے پڑھی ماشاء اللہ چشم بد دور۔ میر منشی گورنمنٹ رضا حسین خان صاحب تشریف فرما تھے۔ سید عابد حسین صاحب بی اے ایک نہایت ذہین اور وسیع الخیال نوجوان بھی موجود تھے۔ بعض اور بزرگوار بھی تھے۔ سب نے نہایت تعریف کی۔ منشی صاحب نے تو نقل

مانگی ہے لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا۔ وہ اثر باعثِ سکونِ خاطر ہے۔ مَیں افسوس کیا کرتا تھا اور صرف ایک آپ کے ہونے سے وہ افسوس کم نہیں ہوا کہ قوم کیوں بے بصیرت ہو گئی ہے۔ اگر جان کو قوت نہیں پہنچا سکتی تو تدبیرِ ہلاکت کی کیوں مرتب ہے دعاؤں میں آیا ہے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ (یا اللہ مجھ کو امرِ حق حق کی طرح دکھا اور توفیق دے کہ اس کا اتباع کروں۔ یا اللہ مجھ کو باطل کو باطل دکھا، اور توفیق دے کہ اس سے اجتناب کروں۔ یا اللہ مجھ کو اشیاء کی حقیقت دکھا جس طور پر کہ وہ واقع میں ہیں) مجھ کو افسوس تھا اور ہے کہ با اثر اور لائق مسلمان یہ دعا کیوں نہیں کرتے یا اس میں اثر کیوں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقائق کی طرف ہے

کافروں کی مُسلم آئینی کا بھی نظارہ کر

کس قدر بلیغ و فصیح و لبریز معنی ہے، اگرچہ یہ لطیف و خوبصورت و بلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور شاعرانہ سلیقے کا نتیجہ ہے لیکن یہ خیال مرتب و باو تعت ہو کر کس کے دماغ کو نصیب ہے۔ گرم گفتاری اور خودداری کے قوافی بھی حقائق کے مضامین سے مزیّن ہیں، شکستِ رشتۂ تسبیح اور پختۂ زنّاری آپ کا حصّہ ہے۔ الغرض جملہ اشعار لاجواب ہیں۔ میری مدح سے بجز اس کے کہ آپ خوش ہوں اور کچھ ہونا نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی بہت ہے۔ لیکن کبھی آپ سے ملاقات ہو اور زبانی گفتگو ان اشعار کے معنی پر ہو تو گوناگوں فواید حاصل ہو سکتے ہیں جو آئندہ طریقِ عمل کے لیے کار آمد ہوں۔ مَیں ہنوز اچھا نہیں ہوا۔ اچھا تو مدت سے نہیں ہوں لیکن ابھی معمولی حالت نے بھی عود نہیں کیا۔ نشست و برخاست میں تکلف ہے تاہم بہت افاقہ ہے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب تشریف فرما تھے، کل دہلی گئے۔ آپ کا ذکرِ خیر فرماتے تھے

بلکہ جاپان کے عزم کا بیان بھی فرمایا، سبحان اللہ اپنا ایک شعر یاد آیا کسی نے اعتراض کیا تھا کہ راہِ سلوک عبث ہے، خدا نہیں ملتا، میں نے کہا:

جنت دجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ

کیوں، میں پوچھوں وہ دلارام ملے گا کہ نہیں

میری ایک غزل کا یہ شعر ہے۔ پس اشاعتِ اسلام کے لیے اٹھنا برائے خود جاں فزا اور روح نواز ہے، اگر کوئی بے سامانی پر خردہ گیری کرے تو اس کے لیے عُرفی کہہ گئے ہیں:

دانم نہ رسد ذرّہ بہ خورشید و لیکن — شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

اور یہ بھی خوب کہا گیا ہے:

مباش اے راہِ نوردِ عشق فارغ از طپیدن ہا

کہ در آخر بجائے می رسد از خود رمیدن ہا

یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہٖ لعلکم تفلحون (سورہ المائدہ، ٦-٣٤)

نہیں معلوم مفسرین نے اس کی کیا شرح لکھی ہے، اردو میں تو یہ معنی لکھے ہیں۔

مسلمانو اللہ سے ڈرتے اور (نیز) اس تک پہنچنے کے ذریعے کی جستجو کرتے رہو۔

آپ کیا کر سکتے ہیں، جو خدا کا حکم ہے کیجیے گا، خدا ہماری اور آپ کی اور سب برادرانِ مسلمان کی عاقبت بخیر کرے، مکرر آپ کی شکر گزاری کرتا ہوں، اب لکھا نہیں جاتا، تھک گیا، مہینوں کے بعد اتنا لکھا ہے۔

دعا گوئے شما اکبر

اٹلی ڈٹرکی کے متعلق بہت لٹریچر ایک پیدا ہو گیا ہے۔ اعتدال شرط ہے

الٰہ آباد

۱۳ر مارچ ۱۹۱۲ء

عزیزی وحبیبی ومکرّمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ میں آج تک آپ کے الطاف نامے کا جواب نہ لکھ سکا تردّدات اور نادرستیٔ مزاج۔ چونکہ مکان کے بعض گوشے خالی پڑے ہیں، ایک طرف جہاں کچھ اسباب رکھا تھا، احاطہ والوں ہی میں سے کسی بددیانت نے تمام بکس اور الماریاں توڑ ڈالیں، کچھ اسباب بھی چوری ہو گیا، کچھ پتہ نہ چل سکا۔ لیکن لوہے کا صندوق نہ کھل سکا۔ میرے تو کوئی کپڑے بھی اُتار کرے جائے تو وہیں تک اثر پہنچے گا جہاں تک سردی معلوم ہو لیکن ہاشم کی ماں کے زیورات جو ہاشم بیچارے کو ملے ہیں اُن کا محافظ ہوں، اُس کے متعلق تردّد میں رہا اور ہوں۔ پھر ایک قدیم و معتبر ملازم نہایت ہوشیار اور خیر اندیش کم عمر مر گیا، پھر ہاشم علیل ہو گئے، اُن کو قے آنے کا عارضہ ہے۔ کبھی کبھی عود کر آتا ہے۔ کچھ خدمتگار ہیں لیکن خیر طلب اور سچا ہمدرد کوئی عزیز نہیں ہے۔ ہاشم کے سبب سے مَیں قید میں ہوں شاید دو ایک سال میں وہ اپنی پوزیشن کو بخوبی سمجھ سکیں۔ حرّتج اور ارادوں اور مذاق میں وہ بے امتیاز ہیں۔ روائتیں سُنتے ہیں اپنے بھائی جان کے وقت کی، جب میری تنخواہ بارہ سَو یا اس سے سوا تھی، پھر خطرناک شوق رغل چلانے کا:

منکہ ملول گشتے از نفس فرشتگاں
جور و جفائے عالمے میکشم از برائے تو

جب ہاشم کی ماں زندہ تھیں تو مَیں جانتا ہی نہ تھا کہ ہاشم کہاں ہیں نہ گھر کے انتظام سے کچھ مطلب تھا۔ یہ ارادہ تھا کہ آنکھ پر آپریشن ہو جائے تو سیاحت میں زندگی بسر کروں جہاں تک صحت اور کیسہ مدد دے۔ یہ خدا کی مرضی تھی کہ سات برس بعد آپریشن میں کامیابی ہوئی تو منتظمہ مکان و مالکہ عشرت منزل چل لبسیں۔ انہیں کے رشتہ دار زیادہ اس شہر میں تھے اور ہیں۔

میں نہ کمیٹی کا مشتاق ہوں نہ بڑے لوگوں کا، اب تو شکستہ حالی، کیا ہمیشہ دل کے لیے شکستہ حالی اچھی رہی ہے۔ آبِ رواں، املی کا درخت، قمری کی آواز، جنگل کا سماں، مسجد کا صحن بہت زیادہ دلکش ہے، نصیب نہیں ہوتا رہا۔ آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں۔

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر پہ دردِ سر اپنا

مدت کا پرانا شعر ہے۔ دیکھا کہ وہ بارِ غم جو میرے دل پر مستولی تھا آپ کے (دل) نے اٹھا لیا۔ وہی درد تھا، وہی سمجھ اور بصیرت تھی، جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن ترشوادی۔ یوں تو ہر شخص کے خیالات علیحدہ ہوتے ہیں اور آپ تو ماشاءاللہ ابھی کم عمر ہیں آپ کو بہت کچھ کرنا ہے۔ سوسائٹی اچھی ہو یا بری، خواہ مخواہ اُس کا ممبر ہو کر حتیٰ الوسع زندگی کو شیریں کرنا ہے۔ میں سیر ہو چکا ہوں صورت و معنی میں ہر طرف تبدیلی پاتا ہوں کہیں صورت باقی ہے تو معنی ندارد، کہیں کچھ ناصاف معنی ہیں۔ تو صورت مکروہ۔ نہایت کم ہے کہ صورت و معنی کا وہی نبوی سانچہ ہو۔ یقیناً زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ بازمانہ بساز صحیح ہے لیکن بے ضرورت بازمانہ بساز کیوں؟ کم از کم یہ کہ مجھ میں یہ قابلیت نہ رہی کہ موجودہ سوسائٹی میں خوش رہ سکوں۔ میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ آپ کبھی ملیں تو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہوگی۔ لیکن آپ کو بھی بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی۔ حسن نظامی کی تحریر سے آپ کی مشغولی طاعت و قرآن خوانی کا ذکر دریافت کر کے خوش ہوا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط

پس آپ شہداء علی النّاس میں داخل ہیں۔ یا انشاءاللہ داخل ہو جائیں گے۔ میرے حق میں بھی دعا فرماتے رہیے۔ بہ سبب تبخیر و قبض کے چار دن سے نماز فجر وقت پر نہیں پڑھ سکتا۔ شعر گوئی میں دل نہیں لگتا۔ میرے ظریفانہ اشعار سے کبھی بہت زندہ دلی اور

شوخی کا قیاس ہو سکتا ہے لیکن عادتاً وہ بھی ایک اسلوبِ ادائے خیال ہے، ورنہ بے حد افسردہ رہتا ہوں، اور نہ بھی افسردہ ہوں تو ایک حیرت سی رہتی ہے اب اعتراض کس پر کروں، وہ زمانہ گزر گیا، رات یہ اشعار ذہن میں آئے،

کامیابی بہرِ ملت ہو تو ناکامی بھلی ۔۔۔ لطفِ دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی

بیوفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو ۔۔۔ دَیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

وغیرہ وغیرہ، لیکن لطفِ دشمن اور کامیابی ضروری اور مطلوب ہے، جب قوم تھی تو سب کہہ سکتے تھے۔ خیر جو کچھ ہو، اب آپ کے سپرد چارج ہے، ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرت کو مول لینے پر مستعد ہیں، آپ کا مصرعہ:

در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند

ہم کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ بیدل نے کہا ہے،

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ

تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ

لیکن آپ کا مصرع بلیغ تر ہے، آپ نہ مانیں تو ہیں توضیح کر دوں گا۔ حسن نظامی نے برمہ کتنا خوب لکھا تھا، وہ تو عالمِ بے خودی ہے لیکن گرہ اور سپند ہوش میں بھی لذیذ ہیں اب تھک گیا، پھر کبھی۔

اپریل ہی میں ہاشم کا امتحان ہے، میں نہیں جانتا کس طرح آسکوں گا، گو قابلیتِ سفر ہو بھی، بہر کیف لاہور وغیرہ کے سفر کا ارادہ تو ہے، خدا اگر پورا کرے،

دعاگوئے شما۔ اکبر

باب پنجم

خطوطِ اقبالؒ بسلسلہ اکبرؒ

۱۔ اکبر بنام مرزا سلطان احمد

خان بہادر مرزا سلطان احمد (ولادت، قادیان ۱۸۵۰ء۔ وفات ۱۹۲۱ء) مرزا غلام احمد قادیانی کے فرزند تھے۔ محکمہ مال کی معمولی ملازمت سے ترقی کر کے ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہوئے اور بعد میں ریاست بہاول پور میں وزیر مال رہے۔ صاحب علم، نقاد اور مبصر تھے۔ اپنے باپ کی نبوت کے قائل نہیں تھے۔ قادیانیوں کا خیال ہے کہ آخر عمر میں انہوں نے اپنا نظریہ بدل لیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب! اکبر اور اقبال دونوں سے مراسم تھے اور وہ دونوں کے فن اور افکار کے قدر دان تھے۔

الہ آباد، ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۲ء

میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے مکرمی ڈاکٹر اقبال کے نام پر اس کتاب[1]

۱۔ "فنون لطیفہ" از مرزا سلطان احمد

کو معنون کیا۔ حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے اور کیا طرزِ ادا ہے، کیا بلاغت ہے۔ مغربی لٹریچر کی تکمیل، اس پر یہ رنگ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی صدقے ہو۔ ان کا یہ مصرعہ:

در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند

میں کبھی نہیں بھولتا۔

میں ان کی طرف سے بھی سپاس گزاری کرتا ہوں۔ اگرچہ اب تک مجھ کو ان سے بھی ملنے کی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ عجیب قید میں ہوں۔ اس موسم میں ناتوانی اجازتِ سفر نہیں دیتی۔ یہاں سردی تیز ہے۔ ہاشم کے اسکول میں مئی میں تعطیل ہوتی ہے۔ اس وقت گرمی کی شدت ہوتی ہے۔ دیکھئے کب زیارت کا موقع ملتا ہے بہرحال اس مطلع سے تسکین ہو جاتی ہے۔

آرزو دنیا میں کب نکلی الالابصار کی
چشمِ موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی

(صفحہ ۴۷، ۴۸)

الٰہ آباد، ۲۴ جنوری ۱۹۱۳ء

ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔ صرف چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے کو الٰہ آباد تشریف لائے تھے۔ آپ صاحبوں کا کرم ہے۔ نیک دلی ہے ورنہ میری کیا ہستی ہے:

جل بسے اسبابِ غفلت چشمِ عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

ڈاکٹر اقبال صاحب بلحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیاتِ الٰہی میں سے ہیں۔ آپ نے بجا ان کی مدح کی ہے۔ وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم فلاسفر نیک دل بزرگ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ (صفحہ ۴۹)

مراد آباد، ۱ ۹ ستمبر ۱۹۱۳ء

عید میں عشرت اور خواجہ حسن نظامی صاحب میری تسلی خاطر کے لئے یہیں تشریف فرما تھے۔ پرسوں آپ کے دوست اور مداح ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بہ سلسلۂ کانپور مجھ سے ملنے کو تشریف لائے تھے۔[۲] (صفحہ ۵۴)

الہ آباد، ۲۰ جنوری ۱۹۱۴ء

دل کو دل سے راہ ہے۔ میں نے سنا کہ آپ ریاست بہاول پور میں نہیں ہیں، ڈاکٹر اقبال صاحب سے آپ کا اڈریس دریافت کیا گیا تھا۔ ہنوز جواب نہیں آیا لیکن پرچہ "اقبال" لودیانہ میں آپ کا مضمون تحتِ عنوان اقبال نظر آیا۔ دل چاہا کہ اس کی مدح سرائی کروں۔ لیکن وہ خیال اس پیرائے میں ظاہر ہوا۔

خوب ہے موعظتِ حضرتِ سلطان احمد
دل انسان کی چمک خوب کہ سونا بہتر
غفلت و کبر سے غم خانۂ اکبر اچھا
خندۂ جام سے اقبال کا رونا بہتر
ظلم ہے ان کو اگر داد نہ دوں میں لیکن
اپنے مداح کا مداح نہ ہونا بہتر

چونکہ آپ نے اکبر و اقبال کا ذکر خیر اپنے مضمون میں کیا تھا اس بنا پر یہ اشعار موزوں ہو گئے۔ میں نے دفتر اقبال لودھیانہ کو بھیج دیئے۔

آج آپ کا الطاف نامہ پہنچا۔ جناب والا! اگر مجھ میں یا حضرت اقبال میں کچھ ہے تو آپ ہی کے دل کی زبان ہے امام غزالیؒ کے زمانہ میں ایک مغربی سیاح

۱۔ یہ خط غالباً الہ آباد سے لکھا گیا ہے۔

۲۔ سانحہ مسجد مچھلی بازار کانپور کے سلسلے میں۔

جب وطن کو واپس گیا تو کسی نے پوچھا کہ اسلام کی نسبت تم نے کیا رائے قائم کی۔ اس نے کہا کہ مجھ کو موقع زیادہ تحقیق کا نہیں ملا لیکن امام غزالی سے ملا تھا۔ ایسا شخص چونکہ پیرو اسلام ہے، لہٰذا میں اسلام کی نسبت اچھا خیال رکھتا ہوں (صفحہ ۵۵، ۵۶)

الٰہ آباد، ستمبر ۱۹۱۵ء

گُل و بلبل کا مضمون خطیب میں آپ نے خوب لکھا ہے۔ میں، اقبال دونوں آپ کے مدّاح و شکرگزار ہیں۔ وہ مضمون صرف لطیفہ نہیں ہے بلکہ نہایت معنی خیز ہے۔ صورت سے معنی اور مجاز سے حقیقت کی طرف لے جانے والا ہے جزاک اللّٰہ

(صفحہ ۶۴)

الٰہ آباد، ۶ر اکتوبر ۱۹۱۵ء

اسرار خودی پر آپ کا ریویو جس پرچے میں چھپے مرحمت فرمائیے گا۔ بلحاظ عملی نتائج کے میں ہنوز ان کے نقش خیال پر ایسا حاوی نہیں ہو سکا کہ مناسب داد دے سکوں لیکن خوبیٔ مقصود اور ترکیب اشعار کا کیا کہنا۔ (صفحہ ۶۵)

الٰہ آباد، ۲۵ر جنوری ۱۹۱۶ء

خواجہ حسن نظامی صاحب کو میں نے بار بار یہی لکھا کہ حضرت اقبال کی مثنوی کی مخالفت پر قلم نہ اٹھائیں۔ حضرت اقبال کو بھی میں نے نہ چاہا کہ بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسب فلسفہ کا دُرّہ اٹھائیں۔ بہ عوض اس کے کہ ہم رندانِ بے سامان کے ساقی بنے رہیں۔ ہمارے سروں پہ تیغ بکف آئیں، ہم کو ان سے محبت ہے۔

آنچہ بخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند

پر عمل کرتا ہوں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی غیور طبیعت میں پولٹیکل اور قومی ہیجان زیادہ ہے۔ اگر عملی پہلو سے کچھ اثر نمایاں ہو گیا تعجب ہے۔ لیکن اس وقت تو روز افزوں تفرقہ باہمی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ میں تو بالکل افسردہ دل شکستہ ہوں۔ دنیا کو خوب

دیکھ لیا: وَمَا هٰذِهِ الحیوٰۃ الدنیا اِلّا لَھْو ولَعِبٌ وَاِن الدار الاٰخرۃ لَھِی الحَیَوان ط۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ زندگانی سخت ڈیوٹی ہے، استماع نہیں ہے، ریخ تو شاید اقبال صاحب کو اپنا یہ شعر لکھا تھا۔

واعظا ایں نہ جنون است نہ کافر شدہ ام
اوّلت ناشدہ خمت ز من آخر شدہ ام

میں انشاء اللہ پھر عریضہ لکھوں گا اور کچھ اشعار عرض کروں گا۔ (صفحہ ۶۸-۷۰)

(اس خط کے آخر میں وہ نظم ہے جو "صوفی اور ملا" کے عنوان سے معارف میں چھپی)

الہ آباد، ۲۲ر نومبر ۱۹۱۶ء

حسن نظامی صاحب کا محرم نامہ آپ نے دیکھا ہوگا۔ حضرت اقبال کے خیالات کے متعلق امامت وخلافت سے بھی اطلاع ہوئی ہوگی۔ زمانے نے بے چین کر دیا ہے۔ بلند طبیعتیں اصلاح کی فکر میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جمعیت خاطر عطا فرمائے۔ اس کا فضل چاہیے۔ بحثوں میں تو انتشار ہی انتشار ہے۔ یورپ میں یہی رنگ دیکھتا ہوں۔ آج ایک کتاب لکھی جاتی ہے، کل اس کی تردید چھپتی ہے۔ اتفاق ومحبت باہمی کی بہت ضرورت ہے۔ اتفاق ومحبت کا عام طور پر تو دنیا سے کم وبیش ہمیشہ فقدان رہا ہے اور رہے گا۔ (صفحہ ۷۸)

الہ آباد، ۱۴ر دسمبر ۱۹۱۶ء

ڈاکٹر اقبال صاحب بلاشبہ نہایت عالی خیال بزرگ ہیں اور اسلامی جماعت کے ترقی خواہ۔ ان کی طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی ہے۔ خدا مدد کرے (صفحہ ۸۰)

الہ آباد، تاریخ ندارد، غالباً ۱۹۱۶ء

میں نے اگرچہ اپنی دانست میں اس غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کو پسند نہیں

کیا۔ جملہ مباحث طے شدہ ہیں، اور یوں تو دنیا ہے۔ میں نے مکرر خواجہ صاحب کو لکھا کہ بالکل خاموش رہیں۔ لیکن ان سے نہ رہا گیا۔ ڈاکٹر نے بھی عرض کیا۔ لیکن غالباً وہ ڈیوٹی سمجھ کر مصروف رہے۔

چو بادِ صبا بر گلستان وزد　　چمیدن درختِ جواں را سزد

دنیا کا رنگ، تعلیم کا ڈھنگ، روز افزوں کشمکش، اختلافِ باہمی دیکھ کر سناٹے میں ہوں۔ لیکن خدا سے امید بہتری ہے۔ اشعار کی نسبت عرض کروں گا۔ کاش آپ سے ملاقات ہوتی۔ میں علیل، لاہور میں سردی زیادہ۔ ورنہ کیا اچھا ہوتا کہ وہاں کی سوسائٹی سے حظ حاصل کرتا۔ زبان سے جو کہہ سکتا ہوں قلم سے ادا نہیں کر سکتا۔ اگرچہ دل کے ہر پہلو پر زبان کو بھی قدرت نہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے کاموں کا انجام بخیر ہو۔ ڈاکٹر اقبال صاحب کو تسلیم:

حواس مختل، سمجھ پریشاں، عمل میں سستی، قدم میں لغزش
کبھی کوئی شوق رہنما ہے کبھی کوئی پالسی ہے غالب
مرے مشاغل کی کچھ نہ پوچھو کہ میں ہوں دورِ فلک میں اکبرؔ
مقیمِ دیر و مُریدِ شیخ و اسیرِ قانون و محوِ مغرب
(صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱)

پرتاپ گڑھ، ۲۹ ستمبر ۱۹۲۰ء

معلوم نہیں حضرت اقبال آج کل کہاں اور کس سوچ میں ہیں۔ میں بالفعل پرتاپ گڑھ میں ہوں جہاں میاں عشرت ہیں۔ آپ کے نیاز مند نذیر احمد خاں معلوم نہیں اب کیسے ہیں۔ دو ایک روز میں الہ آباد کا قصد ہے۔ حصہ سوم کے لئے پبلک کا تقاضا ہے۔ زندہ رہا، توانائی پائی تو اس کام کے لئے لکھنؤ کا قصد ہے۔ میرا دل تو نہیں چاہتا۔ شوق ہی نہ رہا۔ لیکن تعمیل ارشاد احباب ضروری ہے (صفحہ ۱۱۷)

۲- اکبر بنام شیخ عبدالقادر

شیخ سر عبدالقادر (لدھیانہ م ۱۸۷۴ء، ۹ فروری ۱۹۵۰ء لاہور) مدیر مخزن۔ عدلیہ کے بلند مناصب پر فائز رہے۔ اقبال کے دوست اور اکبر کے عقیدت کیش۔ اکبر کے ان کے نام کچھ خطوط رقعاتِ اکبر مرتبہ نصیر ہمایوں، ۱۹۲۴ء میں چھپے۔ درج ذیل اقتباسات رقعاتِ اکبر (طبع دوم، ۱۹۴۴ء) سے ماخوذ ہیں (شیخ عبدالقادر کے نام اکبر کے بہت سے خطوط ابھی منظرِ عام پر نہیں آسکے، شاید کبھی دستیاب ہو جائیں تو ان سے موضوع پر مزید روشنی پڑے)

الہ آباد، یکم جولائی ۱۹۱۸ء

میرا یہ حال ہے کہ کچھ کہہ تو لیتا ہوں۔ لیکن ترتیب و طبع کی نہ قوت نہ فرصت نہ امنگ۔ آخرت کی یاد میں لذت پانے کا آرزو مند رہتا ہوں۔ برادران طریقت سے التماس دعا ہے۔

جو سکوت آپ نے اختیار کیا اسکی بڑی قدر میرے دل میں ہے۔ اللہ آپ کو ترقیاتِ ظاہر و باطن عطا فرمائے ہمارے بعض احباب پنجاب کے تغیر حال نے تو ہم کو بہت افسردہ کیا ہے۔ دیکھیے انقلاب کہاں رکھتا ہے" (صفحہ ۱۴۳)

الہ آباد، ۳۱ مارچ ۱۹۲۱ء

برادرم، مدت سے معلوم نہیں کہ آپ کس حال و خیال میں ہیں۔ میں بہت علیل رہتا ہوں۔ ناتواں بہت ہو گیا ہوں ..... یہ تو فرمایئے، ڈاکٹر اقبال صاحب کیا کر رہے ہیں۔ عرصے سے خط نہیں آیا۔ کیا پرچہ "زمیندار" آپ کی نظر سے گزرتا ہے۔ ایڈیٹوریل نظم کون صاحب لکھتے ہیں۔ مجھ پر کچھ ریمارک ہیں۔ جن سے تعجب ہوتا ہے۔ کیا لوگ ہیں، کیا زمانہ ہے..." (صفحہ ۱۳۶)

الہ آباد، ۱۲؍اپریل ۱۹۲۱ء

مجھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی انگلستان میں پسند ہوئی۔ مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا۔

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی واہ کا

لیکن وہ بھی کیا کریں، مجبور ہیں۔ میں تو زندگی ختم کر چکا اور ہمیشہ ادھر سے بے نیاز رہا۔ وہ تعلیم ہی نہیں ہے۔ میں نے تو ان دو چار لفظوں میں اپنا مطلب ادا کر دیا ہے:

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
حسن بے حد ہے خودی محدود ہے

میرا مطلع پیش نظر رکھے:

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

آپ اس کے اول داد دینے والے تھے۔ خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے اور باہم ہمدردی عطا فرمائے"

(صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹)

۲۔ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی دہلوی (۲ محرم ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء۔ یکم اگست ۱۹۵۵ء) اردو زبان کے نامور ادیب، صوفی نظام المشائخ کے مدیر، اکبر کے نیازمند، اقبال کے دوست لیکن مسائل تصوف میں ان کے مخالف۔ مندرجہ ذیل اقتباسات خطوطِ اکبر (بنام خواجہ حسن نظامی) طبع سوم ۱۹۵۳ء محبوب المطابع دہلی سے ماخوذ ہیں۔ (خطوط اکبر کا پہلا اڈیشن ۱۹۲۲ء میں چھپا تھا)

الٰہ آباد۔ ۲۹ فروری ۱۹۱۲ء

حضرتِ اقبال کی مشغولی فی الطاعۃ سے نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے۔

چو مجنوں سر برآورد از تہ خاک　　ندا آمد بدو از ایزدِ پاک
کہ اے مجنوں چہ آوردی بدرگاہ　　برآمد از دلِ مجنوں یکے آہ
کہ چنداں شورِ لیلا در سرم بود　　کجا پروائے روزِ محشرم بود

جب لیلا کے تصور میں یہ محویت تھی تو لیلا آفریں کی محبت میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ان کو مبارک باد لکھوں گا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں وہ مجھے اصرار و شوق سے مدعو کرتے ہیں۔ میری اسیری و معذوری کے حالات سے وہ آگاہ نہیں ہیں۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ شاید نجات پاجاؤں۔ میر نیرنگ صاحب کو بھی مبارک باد دوں گا۔ خطاب لسان العصر تو انہی کا عطا کیا ہوا ہے۔ اللہ ان کو مزید عصر کرے۔

(میں نے حضرت اکبر کو لکھا تھا کہ میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسے میں گیا تو ڈاکٹر محمد اقبال کے ہاں ٹھہرا تھا۔ ان کو اور میر نیرنگ کو عبادت گزار پایا تھا۔ حسن نظامی) (صفحہ ۶)

الہ آباد، ۲۵، ستمبر ۱۹۱۵ء

مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ آپ کی دانشمندی حفظِ مراتب، محبت و ہمدردی کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے خوب کیا مضمون رکوا دیا۔ میں نے بھی لکھ بھیجا۔ اگرچہ دوسرے کی تحریر سے مجھ کو کیا تعلق، مگر اس وقت اس کا ذکر ہو ہی کیوں۔ ع

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

پر عمل چاہیئے۔ عارف صاحب نے نیک دلی سے قلم اٹھایا۔ میں ان کا مشتاق و ممنون ہوں۔ لیکن ان کو کیا معلوم کہ میری کیا پوزیشن ہے اور کیا حالات ہیں، کس قدر غلط فہمیاں، بدگمانیاں، دراندازیاں ہو رہی ہیں۔ جب کبھی ہسٹری لکھی جائے اس وقت یہ ریویو کیا جائے۔ اس وقت زیادہ تحسین کچھ نہیں تو رشک انگیز ہو سکتی ہے۔

تصوف اور بے خودی کے ذکر میں جو لذت ہے اسی لذت کی گود میں میرا خیال پلا ہے اور میرے نزدیک تو سارے معانی اسی میں ہیں۔ کوئی فلسفہ اس کے خلاف ہو تو ہم کو ہرگز اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ہم تو اس کو صریح غلط سمجھیں گے۔ باخود مطیع النفس بے خود مع اللہ میں بھی مایوس ہوا، افسوس کیا، تعجب ہوا، لیکن سمجھا کہ اگر کسی کی بہتری ایسے ہی خیالات میں ہو تو ہم کو کیا دخل۔ بس یہی کہہ دینا چاہیئے کہ ع

تو و طوبےٰ و ما و قامتِ یار

میں امید کرتا ہوں کہ مقصود اچھا ہے۔ گو جوانانہ ہو۔ اظہار میں احتیاط نہیں کی گئی۔ غریب تصوف کا رعب ہی کیا تھا لیکن اس نے کچھ بگاڑا بھی تو نہیں کتنے لوگ اس کے دلدادہ ہیں اور وہ باخود بھی ہوں تو کیا کر لیں اور کیا دلیل ہے کہ باخود نہیں ہیں۔ الفاظ سے مزا لیا جاتا ہے۔ ترک کر دیئے جائیں تو کیا نتیجہ؟

میں تو دنیا سے بے تعلق ہو گیا ہوں۔ سوادِ گور نظر میں ہے۔ اللہ کی مہربانی کا طالب ہوں۔ دنیا کے دن۔ اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں اور بے موقع بات کیوں کریں۔

مرید پیرِ مغانم ز من مرنج اے شیخ خراب بادہ آنم وگرنمی دانم (اکبر)

(مولانا عارف صاحب ہسوی (دہلی کے نامور کانگرسی لیڈر) نے حضرت اکبر کے کلام کی نسبت واحدی صاحب کے اخبار خطیب میں ڈاکٹر اقبال کی کتاب اسرار خودی کے خلاف اور تصوف کی حمایت میں مضمون لکھا تھا۔ میں نے اس کی اشاعت روک کر حضرت کو اطلاع دی تھی ۔ حسن نظامی)

(صفحہ ۱۶، ۱۷)

الٰہ آباد۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۵ء

حضرت اقبال کے خطوط آئے۔ میں نے جواب بھی لکھے۔ زمانہ مابعد معلوم نہیں کیا فتوے دے۔ افلاطون بیوقوف بنے۔ حافظ شیراز دھر لئے گئے۔ تو ہم آپ کس گنتی میں ہیں (صفحہ ۲۰)

الٰہ آباد۔ یکم جنوری ۱۹۱۶ء

اقبال لکھتے ہیں کہ میں بھی مضمون لکھوں گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے۔ زوالِ اقبال سے مجھ کو بہت ہی ملال ہوا ہے۔ اس باب میں پھر لکھوں گا۔ میں اقبال کو لکھوں گا کہ اگر ممکن ہو تو اپنی قابلیت کو کسی بہتر اور نتیجہ خیز کام میں صرف کریں۔ واحدی صاحب کو میں نے ایک مطلع لکھ بھیجا ہے۔

سخن میں یوں تو نسبت موقع تکلف ہے خودی خدا سے مجھے کیا یہی تصوف ہے

(میں نے حافظ شیرازی کی اور تصوف کی تعلیم بے خودی کی حمایت میں اقبال کی مخالفت کی تھی۔ اقبال نے اس کا شکوہ حضرت اکبر سے کیا

مکتوب حسن نظامی) (صفحہ ۲۱)

الہ آباد۔ ۱۷ جنوری ۱۹۱۶ء

میرے پیارے خواجہ صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو طریقت پر قائم رکھے۔

حلقہ پیر مغانم ز ازل در گوش است   بر ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

حافظ ہی کی زبان میں دلی مدعا ادا کرنے میں مزا آتا ہے۔ حافظ صاحب نعت میں فرماتے ہیں ؎

نگارِ من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت   بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کون ایسا ہے جو ان کو عاشق رسول اللہ نہ سمجھے اور اس طرز ادا کا شیفتہ نہ ہو جائے   (صفحہ ۲۲)

الہ آباد۔ ۲۱ جنوری ۱۹۱۶ء

حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی۔ اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہو گا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلہ وحدت الوجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ میں آپ کو مناسب اور محفوظ جگہ میں نہ پاؤں گا اگر آپ قرآن مجید سے مسئلہ وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لئے قلم اٹھائیں گے۔ علمائے شریعت نے غالباً فرما دیا ہے کہ یہ مسئلہ جزو اسلام نہیں ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہمہ اوست کہنے سے پہلے "او" کو ثابت کرو، پھر ہست کی توضیح کرو۔ یعنی ہستی کیا چیز ہے اور او کسے کہتے ہیں۔ ہمہ اوست تک پہنچنے ہی نہ پاؤ گے کہ حواس سے تشریف لے جائیں گے۔ حضرت اقبال خودی کو بڑھا کر ہمہ منم کہہ دیں تو مطلب حاصل ہے۔ شیخ سعدی کی نظم کیوں نہ پڑھ دیجئے۔ بوستان میں ڈھونڈ لیجیے۔

چو سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بجیب عدم درکشد

دہ عقل جز پیچ پر پیچ نیست — برعارفاں جز خدا ہیچ است

آپ کو عذر نہ ہو تو ہم کو عذر نہیں کہ یہ شائع ہوں۔ ثقافت نہیں ہے ؎

حضرت اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی ان میں اُن میں بانکپن

جب نہیں ہے زورِ شاہی کیلئے — آ و گتھ جائیں خدا ہی کے لئے

درزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی

"سہت در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

(ص ۲۲، ۲۴)

الٰہ آباد۔ (۲۵، ۲، مارچ ۱۹۱۶ء؟)

جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل پرائیویٹ ہے ع خوشی معنیٰ دارد کہ در گفتن نمی آید۔ فتنہ فرد کرنے کی کوشش چاہیئے۔ ہر پہلو سے ہمارا ہی نقصان ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ اگر کچھ اور لکھتے تو مجھ سے ملنے کے بعد یا بہرکیف کچھ انتظار اور صبر کرکے۔ نیک دلی اور صحیح خیال کے نافذ کرنے میں بھی نیک اور صحیح طریق کی ضرورت ہے۔ بوجہ نیازمندی لکھتا ہوں۔ ورنہ مجھے کیا۔ میونسپل مولوی اور قومی شحنہ دونوں کو مکرم اور محترم سمجھتا ہوں اور ادب سے سلام کرنے کو تیار ہوں۔

(ڈاکٹر سر محمد اقبال کی کتاب اسرار خودی میں حضرت حافظ شیرازی اور تصوف، کی مخالفت کے خلاف میں نے مضامین لکھے تھے۔ جس سے اقبال مجھ سے خفا ہو گئے تھے۔ حسن نظامی) (صفحہ ۸)

الٰہ آباد۔ ۲، فروری ۱۹۱۶ء

مکرمی زاد لطفہ۔ دام مگس میں سرسری نظر سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ پرچہ صوفی میرے پاس آتا ہے۔ آپ کا ریویو بھی دیکھ لیا اقبال صاحب کی

پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مشرق و مغرب دونوں کے لیے بھیانک ہو گئی ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے اِنَّ اَکرَمَکُم عِندَ اللہِ اَتقٰکُم۔ مسلمان تو وہ ہے جو ہے مسلمان علم باری میں کروڑوں یوں تو ہیں لکھے ہوئے مردم شماری میں
اگر رسول اللہ کے رنگ میں لیا جائے تو لیسنس کی ضرورت ہے۔ اگر دین صرف حصولِ دنیا کا ذریعہ سمجھا جائے تو بے دینی ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ کالج کے ذریعے سے معاش کی جائے جیسا کہ خود مصنف نے کیا ہے اور سب کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن کالج کو کلید دین کیوں کہا؟ بہر کیف اقبال سے زیادہ نہ لڑیئے۔ دعائے ترقی و درستیٔ اقبال کیجیے (صفحہ ۲۴، ۲۵)

الٰہ آباد ۱۵ر جولائی ۱۹۱۶ء

ڈاکٹر اقبال صاحب نے اسرار خودی میں سری کرشن جی مہاراج کو قابل تعریف ادب کے ساتھ یاد کیا ہے اور ان کی تعلیم کو برقرار رکھا ہے۔ (ص ۲۶)

الٰہ آباد۔ ۹ر اگست ۱۹۱۶ء

میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا۔[1] میں نے ان کا خط دیکھ کر آپ کی مخاطب کر کے چند

۱۔ اکبر دونوں متحارب حضرات (اقبال و حسن نظامی) کو سمجھا بجھا کر مفاہمت کی راہ پر لا رہے تھے۔ اس سلسلے میں حسن نظامی اکبر کو لکھتے ہیں (اگست ۱۹۱۶ء کا ایک خط):۔

میں نے اپنی طرف سے ضد و سرکشی کو کبھی قائم نہیں رکھا۔ بر اصلاح

(باقی اگلے صفحہ پر)

شعر کہے ؎

اے خواجہ حسن کر و نہ اقبال کو رد — قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلّی میں اگر — ہیں دشمن فتنۂ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لئے جنوں ہے تم کو اگر — دیوؤں کے لئے بنے سلیماں وہ بھی

(صفحہ ۴۰)

لکھنؤ۔ ۲۴ر اگست ۱۹۱۶ء

میں نے اقبال صاحب کو لکھا تھا کہ حسن نظامی سے محبت رکھنی چاہیئے اہنوں نے لکھا کہ محبت تو رکھتا ہوں لیکن وہ بڑے طریقے سے اظہار مخالفت کرتے ہیں۔ میں نے لکھا کہ آپ کو محبت اس لئے رکھنی چاہیئے کہ خواجہ صاحب کتنا ہی اظہار بے خودی کریں لیکن عملی حالت میں آپ کے شریک غالب ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ پورے دو سال ہو گئے ملنا میسر نہیں ہوا۔ اس خط کا جواب

حاشیہ آمدہ صفحہ گذشتہ

طلب خیال کے آگے جھک گیا۔ اس کے بعد بھی دل صاف نہ ہو تو ضمیر خودداری کی ذلت سمجھتا ہے اور بندۂ خدا ہونے کی ترنگ آتی ہے اور خیال ہر وقت کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کا اور میرا کیا مقابلہ۔ ان کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ میں بے دست و پا ہوں۔ غدر کے زمانے میں مسٹر مٹکلف نے میرے دادا کو پکڑا اور کہا کہ تمہارے ہتھیار کہاں ہیں۔ انہوں نے جیب سے تسبیح نکالی اور کہا یہ موجود ہیں۔ تب بھی اقبال کو میرے سامنے مجھ کو خوش کرنے کو برا کہا جاتا ہے۔ تو خود سجودی دکھتا ہے۔ بعض اوقات لڑنے لگتا ہوں۔ اس وقت خیال کہتا ہے اقبال میرے دوست ہیں۔ ان کو کوئی دوسرا برا کیوں کہے (صفحہ ۴۳، ۴۴)

نہیں آیا۔ حال ہی میں لکھا ہے۔ آپ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال صاحب کے مقاصد کی میں قدر کرتا ہوں۔ لیکن جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ دل شکن اور مضر رسالی ہے۔ سوشل تعلقات کی شیرینی رخصت ہوتی ہے۔

جو کچھ ہو میرے نزدیک ہم کو بہ لحاظ ہماری حالت کے نیکی اور سلامت روی کے ساتھ طاعت باری میں مصروف ہونا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۴۴)

الہ آباد۔ ۶ ر نومبر ۱۹۱۶ء

اقبال صاحب کا خط آیا ہے۔ لکھتے ہیں میں تصوف کے خلاف نہیں ہوں۔ صرف چند مسائل سے اختلاف ہے۔ جو کچھ ہو شکستگیٔ دل بری چیز ہے یا گداز دل کہیے، یہ نہیں تو وہ رنگ نہیں۔ میں نے لکھ دیا کہ خواہش یہی ہے کہ آپ محبوب قلوب رہیں، میں تو عبرت و آلام کے ہاتھوں مردہ ہو گیا۔ میں ہوں اور ایک دوسرا عالم ہے۔ خبر نہیں دنیا کہاں ہے اور اس کی اصلاح کے لئے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیئے۔

آمادہ حریف ہیں ستانے کے لئے　　اور دکھ میں شریک ہونیوالا نہ رہا
زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے بہت　　مر جاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

(صفحہ ۶۱)

الہ آباد۔ ۱۴ ر نومبر ۱۹۱۶ء

مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ! محرم نامے میں آپ نے نہایت قابلیت و محنت سے واقعات جمع کر دیئے ہیں اور طرز بیان ایسا اچھا ہے کہ جس نے دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہاں تک کہ ختم کیا۔ آپ جہاں مقتدا ہیں ہیں کوئی کچھ کہے بہت اچھی نصیحت آپ نے کی ہے۔ مانتا کون ہے۔ لیکن کسی کو غصہ نہیں آئے گا۔ اقبال صاحب نے البتہ بہت ترقی کی ہے ان کو ضرورت ہے۔ میں

یہ لکھ دوں گا ؎

آپ کے ہاتھ میں ہیں ہاتھ نہیں دے سکتا　　　داد دیتا ہوں مگر ساتھ نہیں دے سکتا

خدا کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ پھر جو رنگ چاہو اختیار کرو۔　　(صفحہ ۶۲)

پرتاپ گڑھ۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۱۶ء

حضرتِ اقبال کے خیالات میں بہت تبدیلی ہوئی یا کم سے کم ان کا اظہار ہوا۔ اب ان کو اچھی اور منضبط و مربوط سوسائٹی مل جائے گی۔　(صفحہ ۶۲)

الٰہ آباد۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۱۶ء

زمانہ بہت پُر آشوب ہے۔ قومی حالت نہیں رہی صرف شخصی حالت ہے۔ اکثر صاحبوں نے پوچھا کہ محرم نامے کی جیسا کہ وہ ہے کیا ضرورت تھی۔ میں یہی کہہ سکا کہ شخصی حالتوں کی اصلاح سے کیوں کوئی روکا جائے۔ خیال ہے کہ طعن و بدگمانی سے محفوظ رہیں۔ جب اپنا اقتدار تھا تو اس کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ اقبال صاحب نے تو مجھ کو خط میں لکھا ہے کہ مسئلہ امامت کو انہوں نے مان لیا۔ لیکن یہ نہیں اقرار کیا کہ میں شیعہ ہو گیا۔ خانہ ساز عقائد سے دوسرا مذہب تو قائم ہو نہیں سکتا۔ شغل زندگی سمجھئے　(صفحہ ۶۳)

الٰہ آباد۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۱۶ء

"محرم نامہ" اسرارِ خودی تک نہیں پہنچا۔ مگر ہے قابل داد۔ اچھا ہے اقبال کا کچھ جواب ہو جائے۔　　(صفحہ ۶۵)

الٰہ آباد۔ ۱۷ مئی ۱۹۱۷ء

اپنا ایک نو تصنیف مطلع ..... آپ کو بھی لکھتا ہوں، دیکھئے کہ الفاظ سے کچھ معنی پیدا ہوتے ہیں یا نہیں ؎

زباں سے دل میں صوفی ہی نے اللہ کا نام لایا ہے　　یہی مسلک ہے جس میں فلسفہ اسلام لایا ہے

الہ آباد۔ ۱۸ر مئی ۱۹۱۷ء

پہلا مصرع میں نے بدل دیا ہے ؎

تصوف ہی زباں سے دل میں حق کا نام لایا ہے | یہی مسلک ہے جس میں فلسفہ اسلام لایا ہے

آپ سے کبھی ملنا ہوا تو مفصل گفتگو ہوگی افسوس ہے کہ بعض حضرات بلا غور و فکر تصوف پر اعتراض کرتے ہیں ۔حالانکہ وہ جانِ مذاہب ہے اور دشمن شرک، گویا عملی توحید ہے۔ (صفحہ ۹۲)

الہ آباد ۳۰ر جون ۱۹۱۷ء

ڈاکٹر اقبال نے بھی سری کرشن مہاراج کا ذکرِ خیر اسرارِ خودی میں کیا ہے جنابِ امیر کی بھی بہت مدح کی ہے۔ سر علی امام صاحب کے نام معنون فرمایا ہے وہ زیادہ پولیٹیکل ہے۔ آپ کے رنگ میں سادگی ہے ۔آمد ہے۔ اسرارِ خودی کی توضیح میں میں نے واحدی صاحب کو ایک مطلع لکھ بھیجا ہے۔ دو چار لفظ ہیں لیکن توضیح تو ہو گئی ؎

عشق میں کیوں بے خودی مقصود ہے | حسن بے حد ہے خودی محدود ہے
منکشف ہو جائیں اسرارِ خودی | بے خودی کا بھی یہی دستور ہے

کل میں نے جس غزل کے دو شعر آپکو لکھے ہیں اُسکے دو شعر اور لکھتا ہوں۔ دُوسرا شعر آپ پر صادق آسکتا ہے۔ اگر مصداق بننا چاہیں ؎

دل نفس کا تابع غفلت میں دنیا کی حقیقت کیا جانے
اُمڈے ہیں فریب امیدوں کے طوفاں ہیں بپا ارمانوں کے
تھی عقل زباں پر اے اکبرؔ اور عشق پہ رکھی ہم نے نظر
ممتاز رہے ہشیاروں میں سرخیل رہے دیوانوں کے

(صفحہ ۹۶، ۹۷)

الہ آباد۔ ۳ر اگست، ۱۹۱۶ء

مکرّمی سلمہٗ۔ نیو ایرا جو لکھنؤ سے انگریزی میں نکلنا شروع ہوا ہے ۲۸ جولائی کا پرچہ حضرت اقبال نے میرے پاس بھجوا دیا ہے۔ اس میں ان کا ایک آرٹکل تصوّف کے خلاف چھپا ہے۔ مگر میں نہیں جانتا وہ کون سا اسلامی مشہور تصوّف ہے جو انسان کو دنیا میں سعی سے روکتا ہے۔ بہرحال پڑھے لکھوں کا یہ پرانا شغلِ زندگی ہے انسان کو ضرور مردانگی سے کام لینا چاہیئے۔ لیکن کالج کی پروفیسری، عرب کی مردانگی نہیں ہے۔ جس کا وعظ کہا جاتا ہے۔ اعمالِ نیک اور تقوے ایں مردانگی ہے۔ اقبال نے یہ ٹھیک لکھا ہے کہ ایران نے مذاقِ عرب کو خراب کیا.... (صفحہ ۹۹)

الہ آباد۔ ۱۴ر اگست، ۱۹۱۶ء

اقبال صاحب مراسلت کرتے ہیں، ان کا اثر کیوں نہ کروں۔ لیکن دلی ذوق جاتا رہا۔ شریعت سے کس کو انحراف ہے۔ لیکن یہ رنگ کہاں کہ؎

حلقۂ پیرِ مغانم ز ازل در گوش است
بر ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

قرآن مجید نے بھی اہل دل پر نظر فرمائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب صرف اسی دل کو مانتے ہیں جو اپنچ سے ناپ سکتا ہے۔ خیر یہ تو دور کی باتیں ہیں۔ عبرت اور گدازِ دل کا تو رنگ ہو۔ آپ کی "سیرِ دہلی" سے یہ رنگ کس ہنرمندی کے ساتھ ٹپک رہا ہے (صفحہ ۱۰۱)

الہ آباد ۲ر جنوری ۱۹۱۸ء

اچھا ہے جواب مثنوی لکھا جائے۔ لیکن تصوف کو کچھ اندیشہ یوں بھی نہیں ہو سکتا۔ باغبان، باغِ چمن کو ہزار مُقفّل کرے۔ نکہتِ گل اور صبا و نسیم کو کون روک سکتا ہے سدِ باغ چاہیئے۔ شریعت کو تو جانتے تھے لیکن شریعت

اینڈ کو نئی چیز ہے۔ اقبال صاحب، ہمارے آپ کے دوست ہیں، میں نے لکھا ہے کہ اپنی دینداری کو رحمتِ الٰہی ثابت کیجئے۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے۔

(صفحہ ۱۰۴)

الٰہ آباد ۷، فروری ۱۹۱۸ء

چار مہینے سے میں اخبار ستارہ صبح کو نہیں دیکھتا، کھولتا بھی نہیں۔ اسی اندیشے سے کہ تنفر ہوگا۔ ظفر علی خاں صاحب کو مطلع نہیں کیا۔ کیا فائدہ لیکن ٹوٹو ئیں ہیں اور بے اثر ..... (صفحہ ۱۰۵)

الٰہ آباد ۹، فروری ۱۹۱۸ء

سماع خانے کا حال آپ کے خط میں دیکھ کر انبساط ہوا ہے۔

ہست مجلس براں قرار کہ بود ہست مطرب براں ترانہ ہنوز

حافظ کا شعر یاد آیا۔ قریباً آمد بدہ ہوگیا۔ اقبال صاحب کو لکھ بھیجا کہ مخدومیت کا مستحق نہیں۔ لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کی عظمت اور محبوبیت قائم رہے (صفحہ ۱۰۶)

الٰہ آباد۔ ۹، مارچ ۱۹۱۸ء

کل ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے کہ ۱۶ یا ۱۷ مارچ کو میں الٰہ آباد آؤں گا اور میرے ساتھ ایک اور صاحب ہوں گے۔ جو صرف آپ ہی کے اشتیاق میں آتے ہیں۔

تین سال پیشتر اقبال صاحب میرے مہمان ہوئے تھے۔ مجھی سے ملنے آئے تھے دو دفعہ تشریف لائے تھے۔ اس وقت میں اس قدر دل گرفتہ اور ضعیف نہ تھا۔ تاہم کچھ دلچسپی کی امید ہے آپ ہوتے تو میری قائم مقامی کرتے۔ بندھا کو احکام دیتے۔ میں زیادہ حاضری بھی نہیں دے سکتا۔

ڈاکٹر صاحب سوشل طور پر ایک نعمت ہوں گے۔

ستارۂ صبح کو میں نہیں کھولتا۔ لیکن کچھ لفظ نظر آ گئے کہ آپ کی تفضیلیت پر اعتراض ہے۔ دلچسپ بحث ہے اور موجودہ پولیٹیکل حالت کے اعتبار سے بے ضرر بھی ہے۔

اشاعت اسرار خودی کے بعد بھی آپ سے ڈاکٹر اقبال صاحب سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟ (صفحہ ۱۱۱)

الہ آباد۔ ۱۵ر مئی ۱۹۱۸ء

اقبال صاحب نے لکھا ہے کہ آئندہ ایڈیشن سے شکایت حافظ کو خارج کر دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ بہت اچھی بات ہے۔ (صفحہ ۱۱۳)

سید سلیمان صاحب نے میری ایک نظم معارف میں چھاپی ہے[۱]۔ ملا اور صوفی کی بحث۔ لیکن غلط چھاپی۔ تین چار جگہ غلطیاں ہیں۔ بعد صحت مرشد میں نقل ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۱۳)

الہ آباد۔ ۲۳ر مئی ۱۹۱۸ء

معارف نے میری نظم ملا و صوفی بلا میری درخواست کے چھاپ دی۔ ڈاکٹر اقبال صاحب کو پسند نہیں آئی۔ لیکن اس میں کسی کی حمایت نہیں ہے۔ مصلحت اندیشی ہے (صفحہ ۱۱۴)

الہ آباد۔ ۱۲ر جون ۱۹۱۸ء

اصل یہ ہے کہ نشاط امید فردا سے طبیعت خالی ہو گئی ہے۔ جو مجھ پر گزری ہے، جس پر یہ گزرے ایسا ہی ہو جائے۔ ناتوانی اور ناتندرستی مزید برآں۔ لٹریری مذاق کی کرامت ہے کہ زبانِ قلم سے مجھ کو نہ صرف زندہ بلکہ بیداری کے ساتھ زندہ ظاہر کرتی ہے۔ ورنہ اگر زندہ ہوں بھی تو عبرت اور دنیا سے

۱۔ معارف اپریل ۱۹۱۸ء

مایوسی کی گہری نیند سو رہا ہوں۔ یعنی زیادہ تر آخرت کا خواب دیکھتا ہوں۔ کبھی پھر ملئے۔ کیا مزا ہو اگر جواب دیجئے کہ "جب کہیئے"۔ اقبال صاحب سے بھی بڑا لطف تھا۔ لیکن افسوس کہ اب ان کے سامنے شراب نہیں پی سکتا۔[1] (صفحہ ۱۱۶)

الٰہ آباد، ۱۳ر جون ۱۹۱۸ء

ڈیئر خواجہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ شریعت و طریقت والے مضمون کی کچھ جلدی نہیں ہے۔ مکمل کر کے انشاء اللہ پیش کروں گا۔

میں کہتا ہوں سب مسلمانان شریک صف نماز کو باہم اتحاد چاہیئے۔ خیالات میں اختلاف ضروری ہے۔ اس اصول پر ہم کو بھی کسی سے بیزاری اور نفرت نہ چاہیئے۔ صرف اس لئے کہ وہ ہمارے خیال یا مذاق میں شریک نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود ہم سے دوری اور علیحدگی نہ چاہے۔ ڈاکٹر اقبال صاحب سے آپ سے خط و کتابت ہے یا نہیں۔ نیرنگ صاحب تو ان کے بڑے دوست تھے شاید اب بھی ہوں۔ مجھ کو خواہ مخواہ ان خیالات میں واقعات نے الجھا دیا ہے اللہ علیہ نجات دے۔

خودی کے حس پہ بھی ہوتا ہے انتشار اکبر
کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتہ نہ چلے

(صفحہ ۱۱۷)

الٰہ آباد۔ ۲۲ر جون ۱۹۱۸ء

میرے کلیاتِ حصہ اوّل کے صفحہ ۹۵ میں آپ یہ شعر پائیں گے۔

خودی و بے خودی دونوں ہیں عکس صورتِ جاناں
اسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

۱۔ یعنی تصوف کی بات اور حافظ کا ذکر نہیں کر سکتا۔

اقبال صاحب نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کو شائع کیا ہے۔ آپ ایک لطیفہ لکھ سکتے ہیں کہ آپ صاحبوں کے دعاگو نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ مقصود بہر صورت اللہ پاک ہے۔ (صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸)

الہ آباد ۸ر اگست ۱۹۱۸ء

مکرمی السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ ماجد میاں سلمہٗ کے خط سے معلوم ہوا کہ ظفر علی خاں صاحب کو حیدر آباد سے خارج البلد کرنے کا حکم ہو گیا۔ چار دن میں نکل جائیں۔ بڑی دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔ افسوس بھی ہوا تردد بھی۔ افسوس یہ کہ اطمینان و آسائش سے اچھے عہدے پر تھے۔ اس سے جدا ہوں گے۔ تردد یہ کہ کہیں پھر نہ تصوف کے سر ہو جائیں۔ (صفحہ ۱۱۹)

الہ آباد ۹ر اگست ۱۹۱۸ء

اقبال صاحب کے خط آتے رہتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ ہم غریبوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اللہ استقامت عطا فرمائے (صفحہ ۱۲۲)

الہ آباد ۲۶ر اگست ۱۹۱۹ء

اقبال صاحب کا بھی خط آیا ہے۔ مجھ کو آپ کی تصنیف متعلق یزیدؔ معاویہ سے کچھ بحث نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ نے اخلاقی حالت کے اعتبار سے یہ سب کچھ لکھا۔ نہ یہ کہ مسئلہ خلافت و امامت میں آپ نے مسلکِ شیعہ کی طرفداری کی (صفحہ ۱۵۰)

الہ آباد۔ ۵ر مارچ ۱۹۲۰ء

۲۹، فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے۔ کسی مقدمے میں ضلع گیا کو گئے تھے۔ مجھ سے ملنے کو اس طرف گزرے۔ تین دن رہے۔ ان میں میں نے بہت پولیٹیکل نشاط طبع پایا۔ دنیا با امید قائم۔ (صفحہ ۱۶۳)

۴۔ اکبر بنام عبدالماجد

عبدالماجد دریابادی (ولادت ۱۸۹۲ء، وفات ۱۹۷۷ء) اردو کے معروف فلسفی، ادیب، مفسر، مدیر۔ سچ، صدق و صدق جدید۔ فلسفے کی تعلیم نے شروع میں الحاد کی راہ پر ڈال دیا، پھر اکبر کی صحبت اور مولانا اشرف علی تھانوی کے اثر سے دین کی طرف رغبت ہوئی اور یہ دینی رنگ پختہ رہا۔ اکبر نے انہیں دو سو سے زائد خطوط لکھے جو الگ مجموعے کی صورت میں بھی اور خطوطِ مشاہیر میں بھی چھپے۔ عبدالماجد کے نام اقبال کے خطوط اقبال نامہ حصہ اوّل میں شامل ہیں۔ ذیل کے مندرجات "خطوط مشاہیر" سے ماخوذ ہیں (تاج اڈیشن، طبع سوم):

الٰہ آباد، ۱۰ ستمبر ۱۹۱۲ء

عزیزی و حبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ محبت اور قدر افزائی کا بہرا پاشکر گزار ہوں۔ علیل تھا۔ پھر مہمانوں کا سلسلہ رہا۔ کل ڈاکٹر اقبال صاحب جو مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے، دہلی گئے۔ اس سبب سے جوابِ خط اب تک نہ لکھ سکا۔ ـــــ الخ (صفحہ ۴۸)

الٰہ آباد۔ ۹ فروری ۱۹۱۵ء

عنایت فرمائے من۔ جب آپ اپنے آپ کو اس فرض کے انجام دینے کے قابل سمجھتے ہیں تو یہ سند کافی[1] ہے۔ میں آپ کے خط کو ڈاکٹر اقبال صاحب کے پاس بھیجتا ہوں۔ اگر کوئی دوسری تجویز پیشِ نظر نہ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب

۱۔ پنجاب یونیورسٹی میں اردو لیکچرار کی جگہ قائم ہوئی (بقول ماجد) اور انہوں نے اس کے لیے مرضی دی تھی میرے خیال میں شاید اس وقت کوئی ایسی تجویز ہوئی ہوگی اردو لیکچرارشپ پنجاب یونیورسٹی میں ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی تھی۔

غالباً لحاظ فرمائیں گے۔ الخ (صفحہ ۴)

الہ آباد، ۱۱ فروری ۱۹۱۵ء

عزیز مکرم، سلمہ اللہ تعالیٰ! میں نے اسی وقت ایک طویل تحریر کے ساتھ جس میں مختصراً آپ کے اوصاف درج تھے، مع آپ کے خط کے ڈاکٹر اقبال صاحب کو بھیج دیا تاکہ وہ آپ کی پاکیزہ اور ستھری زبانِ اردو کو خود دیکھ لیں۔ الخ (ص ۵)

الہ آباد۔ ۱۵ فروری ۱۹۱۵ء

حبیبی و عزیزی، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ ڈاکٹر اقبال صاحب کا خط بجنسہٖ ارسالِ خدمت ہے۔ کاش آپ سے ان کی ملاقات مراسلت ہو جاتی۔ الخ صفحہ ۵

جونپور، ۱۲ مارچ ۱۹۱۵ء

عزیزم محترم، سلمہ اللہ تعالیٰ! حضرت اقبال صاحب کا خط آیا ہے یہ فقرہ اسی میں ہے "عبدالماجد صاحب کی نسبت رجسٹرار یونیورسٹی کو لکھا ہے۔ دیکھیے سنڈیکیٹ اردو لیکچررشپ کا کیا فیصلہ کرتی ہے"۔ اطلاعاً لکھتا ہوں۔ الخ (صفحہ ۸)

الہ آباد، ۱۹۱۵ء

عزیزی و حبیبی۔ جواب خط پھر لکھوں گا۔ اس وقت آپ کا کارڈ دیکھ کر آپ کے ریمارک پر بے ساختہ ماشاءاللہ چشم بددور کہتا ہوں۔ اوّل تو یہ کہ وہ مسئلۂ فلسفہ آپ کے ذہن میں تھا۔ دوسرے (اور یہ بڑی بات ہے) یہ کہ آپ نے آپ کے ذہن نے میرے شعر کو فوراً اس فلسفے کے مطابق کر لیا۔ جب میں نے یہ شعر کہا تھا، اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ ابتداءً ایک یونانی فلاسفر نے یہ مسئلہ بیان کیا تھا۔ اسی طرح جب میں نے یہ شعر کہا ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اور جس کی داد ڈاکٹر اقبال صاحب نے دی، اس وقت مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہیگل نے اس خیال کو وسعت دی ہے لیکن فلسفہ ہے کیا؟ نتیجہ غور و فکر کا! الخ (صفحہ ۸۰)

جونپور، ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء

دو نئی تصنیفیں نظر سے گزریں۔ ایک معارج الدین مصنفہ مولوی نواب علی صاحب ایم۔ اے بڑودہ کالج جس میں سائنس و فلسفہ پر ریویو کر کے مصنف نے مذہب کی حمایت کی ہے۔ دوسری مثنوی اسرار خودی مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب، جس میں مصنف نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت اثر ہوا، صحیح نہیں ہے، خودی کو بڑھانا چاہیئے۔ دونوں کتابیں آپ کے ملاحظہ کے قابل ہیں۔ مثنوی کی نسبت تو کچھ زیادہ نہ کہنا چاہیئے کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے۔ اشعار نہایت اچھے ہیں۔

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص　　　　می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

یہ خود ہی مستی اور تصوف ہے۔ دیباچے میں پولیٹیکل دانشمندی بھی ہے۔۔۔ الخ (صفحہ ۸۲)

الہ آباد۔ ۱۹۱۶ء

میں ہنوز اچھا نہیں ہوا۔ اچھا تو اب کیا ہونگا۔ یہ مطلب ہے کہ قابل سفر نہیں ہوں۔ اس وقت مدت کے بعد ڈاکٹر اقبال کو ایک خط لکھا ہے اور یہ خط آپ کو۔۔۔ الخ (صفحہ ۹۵)

الہ آباد، ۶ اگست ۱۹۱۶ء

حضرت اقبال معلوم نہیں کیوں تصوف کے پیچھے پڑے ہیں "نیو ایرا" میں ان کا مضمون چھپا ہے۔ میں فارمل صوفی کبھی نہیں ہوا۔ نہ قوت نہ ضرورت لیکن اورینٹل فلاسوفی تو عالمگیر مذاق ہے۔ اسلامی تصوف خود کہتا ہے کہ خلافِ

شریعت کچھ نہ ہو۔ خیر دنیا کے رنگ ہیں... الخ (صفحہ ۱۲۳)

الہ آباد، ۲۵ ر اگست ۱۹۱۷ء

"ہندوستان ریویو" میں آرٹیکل خواجہ صاحب کے خلاف چھپا تھا اور اقبال صاحب کا ایک مضمون تصوف کے خلاف۔ اقبال صاحب کی طبیعت نے عجیب تنگ اور بیہودہ راہ اختیار کی ہے۔ دیدنی ہے جہانِ زنگار رنگ ... الخ (صفحہ ۱۲۶)

الہ آباد۔ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء

اقبال صاحب بھی جا رہے ہیں۔ ان کو حیدری صاحب نے بلایا ہے۔ اقبال صاحب کو آجکل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے۔ کہتے ہیں کہ عجم کی فلاسفی نے عالم کو خدا قرار دے رکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ خلاف اسلام ہے۔ میں نہیں جانتا یہ کیا ترنگ ہے۔ اسلام نے تو لیس کمثلہ شیئ" کہہ دیا ہے۔ آخر کتاب مسٹر فلسفی کی نکول نے جو آکسفورڈ میں پروفیسر ہے حال ہی میں شائع کی ہے، مبسوط کتاب ہے۔ آپ کے دوست برگسان تک کا اس میں نوٹس لیا ہے۔ کثرت میں وحدت، وحدت میں کثرت ثابت ہے۔ ہندو فلاسوفی کو اسلام پر اعتراض ہے کہ اس نے خدا کو الگ سمجھا ہے۔ حالانکہ اسلام نے نہ یہ کیا ہے نہ وہ کیا ہے۔ ہم کو یہ بحث ہی نہ چاہیے اور اس کا نتیجہ کیا؟ (صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹)

الہ آباد - ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء

عزیزم مکرم، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ میں خوش ہوا کہ آپ نے اس مضمون کو حرف بحرف پسند کیا۔ بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑا تھا۔ سید سلیمان صاحب شوق و اصرار سے لے گئے تھے۔ میرے پاس تو صدہا قطعات اور مثنویاں موجود ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیراز کو علانیہ بُرا بھلا کہا ہے، میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی اسرار خودی

آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب مثنوی رموزِ بے خودی شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہیں دیکھی۔ دل نہیں چاہتا۔ خط و کتابت ہے۔ لیکن میں ان کے انقلابِ طبیعت سے خوش نہیں ہوں۔ ہونا اچھا بننا برا۔ بہرکیف کوئی سیریس معاملہ نہیں دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے اور ان روز دل تو طوفان اختلاف برپا ہے (صفحہ ۱۳۵)

دہلی، ۲۵ر نومبر ۱۹۱۹ء

ڈاکٹر اقبال صاحب، مرزا سلطان احمد صاحب وغیرہ نے لکھا ہے کہ ملنے آئیں گے۔ خدا جانے کب تک رہ سکوں (صفحہ ۱۷۶)

الہ آباد، ۱۹ر مارچ ۱۹۲۰ء

ڈاکٹر صاحب ملنے آئے تھے۔ تین دن رہ کر گئے۔ کہتے ہیں اگر میں آپ کے ساتھ رہتا تو ایک مجموعہ مرتب کرتا۔ (صفحہ ۱۸۶)

اکبر اور اقبال

"اکبر، پیش رو اقبال" آج سے پندرہ برس پیشتر اس عنوان سے میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ "اقبال" لاہور (بابت اپریل ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوا، اور بعد میں میری تالیف "نقدِ اکبر" میں بھی شامل ہوا۔ اور اب ترمیم و اضافے کے ساتھ زیرِ نظر تالیف میں پہلا باب ہے۔ اس موضوع پر لکھنے والے کچھ میرے بھی پیش رو ہیں، میرے خیال میں اس موضوع پر سب سے پہلے اور اکبر و اقبال کی زندگی میں قلم اٹھانے والے مرزا سلطان احمد تھے (لیکن ان کا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا، یہ مضمون رسالہ "اقبال" لدھیانہ میں ۱۹۱۳ء کے آخر یا جنوری ۱۹۱۴ء میں چھپا تھا)۔ اس موضوع پر دوسرا مضمون غالباً "اکبری اقبال" کے عنوان سے "نقاد" آگرہ میں چھپا جس میں اقبال کی ظریفانہ شاعری پر، جو انہوں نے بقول خود اکبر کے تتبع میں اور انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے

کے بیے کہی تھی، نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اقبال نے اکبر کے نام ۱۶ر جولائی ۱۹۱۴ر کے خط میں "نقاد" کی تنقید پر اپنے احساسات بیان کئے ہیں، اکبر نے بھی خط لکھ کر نقاد کے مدیر کی حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ (نقاد کا یہ مضمون بھی راقم کو دستیاب نہیں ہوا)۔ اس موضوع پر تیسرا مضمون دیا نرائن نگم مدیر "زمانہ" کا تھا "اردو شاعری اور شعرائے حال" کے عنوان سے، جس میں اکبر اور اقبال کے کلام پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ یہ مضمون بھی اکبر اور اقبال کی زندگی ہی میں لکھا گیا، پہلے کانپور میں قومی ہفتہ کی ایک تقریب میں پڑھا گیا، پھر "زمانہ" کی اشاعتوں اکتوبر و نومبر ۱۹۱۸ر میں بالاقساط چھپا، پہلی قسط میں اکبر کی شاعری پر تبصرہ تھا، دوسری قسط میں اقبال کی شاعری کا جائزہ لیا گیا تھا۔

چوتھا مضمون پروفیسر عبدالقادر سروری کا ہے جو عنوان بالا کے تحت لکھا گیا اور علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر میں ۱۹۵۰ر میں چھپا۔ ان مستقل مضامین کے علاوہ ضمناً تو اکبر و اقبال کا تذکرہ اکثر ادبی تاریخوں اور تنقیدی مضامین میں آتا ہی ہے۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے پیش کر دی ہے کہ اس موضوع کی قدامت و اہمیت بھی واضح ہو جائے اور یہ بھی ظاہر کر دوں کہ یہ کوئی اچھوتا موضوع نہیں ہے لیکن پھر بھی اتنا تشنہ ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھنے اور کہنے کی گنجائش باقی ہے۔

اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر راقم نے اظہار عقیدت کے طور پر جو چند نگارشات پیش کرنے کی جسارت کی ہے ان میں دو تالیفات "اقبال کا ذہنی ارتقاء" اور زیر نظر "اکبر اور اقبال" بھی شامل ہیں۔ اکبر اور اقبال کے موضوع پر پہلے مضمون اور اب کتاب لکھنے کے باوجود میں نے اوپر اسے تشنہ موضوع قرار دیا ہے تو اس لئے کہ تلاش بسیار کے باوجود میں ابھی ان خطوط کے بارے میں بھی کوئی معلومات حاصل نہیں کر سکا جو اکبر نے اقبال کو لکھے اور جنہیں اقبال حرز جاں بنا کر اپنے قیمتی مسودات میں رکھتے تھے۔ (صرف دو خط ملتے ہیں جو

چراغ حسن حسرت مرحوم نے "شیرازہ" کے اقبال نمبر میں شائع کر دیئے تھے)[1]۔ اسی طرح اقبال کے خطوط اکبر کے نام بھی نامکمل ہیں جو کچھ مواد اب تک مل سکا ہے، اُسے زیرِ نظر تالیف میں سمو دیا گیا ہے۔ اللہ کی توفیق شاملِ حال رہی تو آگے تلاش جاری رہے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے علمی اداروں کو اس امر کا پوری طرح احساس ہی نہیں ہوا کہ اقبال کی فکر و نظر پر کام کرنے کے لیے اقبال کے فکری مآخذ کی جستجو و تحقیق کا مسئلہ کتنا اہم اور اس پر کام کتنا ضروری ہے، یہ کام کسی فردِ واحد کے کرنے کا نہیں بلکہ کسی بڑے ادارے میں مربوط اور منظم طریقے سے کرنے کا ہے، انہی مآخذ میں ایک اہم موضوع اکبر الہ آبادی بھی ہیں، اقبال نے اکبر کی وفات پر ان کے فرزند عشرت حسین کے نام تعزیتی خط میں یہ لکھا تھا:

"ابھی زمیندار سے آپ کے والد بزرگوار (اور میرے مرشدِ معنوی) کے انتقال پر ملال کی خبر معلوم ہوئی۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ان سے آخری ملاقات نہ ہو سکی اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے

---

[1] ۔ ہفتہ وار شیرازہ کا اقبال نمبر علامہ اقبال کی وفات کے غالباً ایک دو ماہ بعد نکلا تھا۔ شیرازہ کا ایک فائل میری نظر سے گذرا لیکن اس میں یہ نمبر نہیں تھا۔ شیرازہ کے اقبال نمبر کو بعد میں چراغ حسن حسرت نے کتابی صورت میں "اقبال نامہ" کے عنوان سے شائع کر دیا تھا۔ حسرت نے اس کی بھی کہیں وضاحت نہیں کی کہ انہیں متذکرہ بالا اکبر کے خطوط کہاں سے ملے، فقیر سید وحید الدین کے ایک بیان (روزگارِ فقیر) سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ خطوط چودھری محمد حسین کے پاس تھے، بہر حال اقبال کے مسودات اور دستاویزات میں یہ خطوط اور بہت سی اور قیمتی تحریریں (شاید قائد اعظمؒ کے خطوط بھی) ملنے کی توقع ہے۔

تو ان کی زیارت کے لیے الہ آباد کا سفر کروں، انہوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا تھا کہ امسال ضرور ملنا، بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں، میری بدنصیبی ہے کہ میں ان کے آخری دیدار سے محروم رہا ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔

اسلامی ادبیوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے، زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے ایک اکبر اسے ہاتھ آتا ہے کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لیے کچھ عرصہ اور جاری رہتا۔

خدا اپنے حبیب کے صدقے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے میں نے ابھی ایک تار بھی آپ کو دیا ہے۔

مخلص : محمد اقبال

اور اس تار کا مضمون یہ تھا:

"HEARTFELT SYMPATHY,

INDIA LOSES A GREAT PERSONALITY"

مذکورہ بالا تعزیتی خط کی تحریر کے تین روز بعد ۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو اقبال اپنے پرخلوص جذبات کا اظہار مولانا غلام قادر گرامی کے نام خط میں یوں کرتے ہیں۔ (یہ واضح رہے کہ مولانا گرامی اقبال کے بے تکلف دوست، بے لاگ مداح اور مشیر سخن تھے):

"ڈیر گرامی، السلام علیکم!

"آخر ما حبیب تمنا تھی!"

اس مصرع نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ اکبر مرحوم کے انتقال سے پہلے ہی میری طبیعت افسردہ ہو رہی تھی، اس مصرع نے نشتر کا کام کیا۔۔۔۔۔ اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیت میں کم بلند نہ تھا، اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی، یوں تو کئی سالوں سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی رفیق اعلیٰ سے ملنے کے لیے ایک تڑپ تھی، مگر گذشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے، کوئی خط ایسا مشکل سے ہو گا، جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو۔

ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے، زندگی سے محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروسِ حیات سے ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے اور اختلاط کا نتیجہ انس ہے بہر حال وجہ خواہ کچھ بھی ہو، میں نے تو یہ کلیہ صوفی اکبر مرحوم کی صورت میں صحیح نہ پایا۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے، مسلمانانِ ہند کو اپنے اس نقصان کا شاید پورا پورا احساس نہیں ہے۔"

(مکاتیب اقبال بنام گرامی، صـ ۱۷۱)

اقبال کا مرثیۂ اکبر بھی ان کے جذباتِ درد و غم کا آئینہ دار اور اکبر کے اسلامی تہذیبی مشن پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے:

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر — حیاتش بحق بود روشن دلیلے

سرِ ذرۂ طور معنی کلیمے بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
نوائے سحرگاہ او کارواں را اذانِ درائے پیامِ رحیلے
ز دلہا برافگندۂ لات و عزیٰ زجا ہا کشائندہ سلسبیلے
دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

اکبر اور اقبال کا رابطہ کب قائم ہوا؟ ان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ ان کی ملاقات کتنی بار ہوئی؟ دونوں حضرات نے ایک دوسرے کے بارے میں نثر و شعر میں جذباتِ خیر سگالی و عقیدتِ باہمی کا اظہار کس کس طرح کیا؟ قومی مسائل کے بارے میں انہوں نے کن کن امور پر تبادلہ خیال کیا؟ ان موضوعات پر تفصیل سے بحث تو پہلے باب میں کی گئی ہے۔ اس موقع پر اختصار سے چند باتیں عرض کروں گا۔

اقبال جس زمانے میں سیالکوٹ اور لاہور میں اپنی تعلیم کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس وقت اکبر اپنے ظریفانہ اسلوب میں قومی مسائل و احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے ملک میں مقبولِ خاص و عام ہو چکے تھے۔ اکبر کا کلام اُس زمانے میں زیادہ تر "اودھ پنچ" میں شائع ہوتا تھا اور اودھ پنچ ملک کا مقبول ترین مزاحیہ پرچہ تھا۔ اقبال جب گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے اور ایم اے کے طالب علم تھے تو ان کے دوست شیخ عبدالقادر پنجاب آبزرور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ آبزرور میں انہوں نے اردو کے معاصر شاعروں و ادیبوں پر تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ قیاس غالب ہے کہ اس ماحول میں اقبال، اکبر کے کلام سے روشناس ہوئے ہوں گے لیکن یہ وہ دور ہے جب وہ داغ کے شاگرد تھے اور ان کے رنگ میں شعر کہتے تھے، اکبر سے وہ کچھ خاص متاثر نہ ہوئے۔ پھر اپریل ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے ماہنامہ مخزن جاری کیا جو اردو ادب کی نئی تحریک کا نقیب ثابت ہوا۔ مخزن کے پہلے شمارے ہی میں اقبال کی نظم "ہمالہ" چھپی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا، اس طرح اقبال

کی شاعری کا چرچا لاہور اور پنجاب سے نکل کر ملک کے دوسرے گوشوں میں پہنچا، اکبر کا کلام بھی مخزن کے صفحات کی زینت بن رہا تھا، مخزن کے ذریعے اکبر اور اقبال کی ادبی شناسائی نئے مرحلے میں داخل ہوئی لیکن ابھی باہمی رابطے یا قلمی دوستی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ صورت غالباً اقبال کی انگلستان سے واپسی کے بعد پیدا ہوئی۔

۱۹۰۸ء میں اکبر کے کلیات کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس وقت تک ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات خاصے بدل چکے تھے، انگریزی حکومت پر بھروسہ کرنے کی سرسید پالیسی اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ روس پر جاپان کی فتح نے مغرب کی سیاسی برتری کا طلسم توڑ دیا تھا۔ محکومی کا احساس شدید ہونے کے ساتھ یورپ کی تہذیبی برتری کے بارے میں شکوک پیدا ہو چکے تھے۔ اس منظر نے اکبر کے تہذیبی و معاشرتی نصب العین پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ سرسید کے جانشین، علی گڑھ کے رہنما بھی اکبر کی بزرگی کے معترف ہو گئے اسی زمانے میں اکبر کو لسان العصر کا لقب بھی دیا گیا۔ یہ لقب میر غلام بھیک نیرنگ نے تجویز کیا اور مخزن کی طرف سے پیش ہوا۔ یہیں سے اقبال کی اکبر سے گہری وابستگی اور رابطے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اس کا اظہار پہلی بار اقبال کے اس خطبے میں ہوا جو انہوں نے دسمبر ۱۹۱۰ء میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں دیا، خطبے کا عنوان تھا:-

ISLAM AS A SOCIAL AND POLITICAL IDEAL

مارچ ۱۹۱۱ء میں اس خطبے کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے کیا اور برکت علی اسلامیہ ہال میں سنانے کے علاوہ پنجاب ریویو میں اسے شائع کیا (اقبال کے خطبے کا یہی ترجمہ اب دستیاب ہے)۔ اس خطبے میں دو تین جگہ اقبال نے اکبرؔ کا ذکر کیا ہے۔ اسلامی قومیت اور ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا جائزہ لیتے ہوئے اس بارے میں اکبر کے فکر و فن کو اقبال ان لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

"..... اس اسلوبِ سیرت کی ضرورت کا اعلان ایک شاعر کی زبردست تخیل نے بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے۔ جناب مولانا اکبر الٰہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے، اپنے بذلہ سنجانہ پیرائے میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آج کل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لب و لہجے پر نہ جائیے۔ ان کے شباب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانہ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ آپ ان کا مال خریدنے کے لیے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ لائیں۔"

(پنجاب ریویو، بابت مارچ، اپریل ۱۹۱۱، صفحہ ۸)

دوسری جگہ دورِ اصلاح (انیسویں صدی) کے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

"موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے، جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی تہذیب کے لحاظ سے بھی میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے، اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی خیالات کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکزِ ثقل سے بہت پرے

ہٹا دیا ہے، بلاخوفِ تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابلِ تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں، جیسی ہماری قوم نے ۔لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو، جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے، مغربی تہذیب کے مشاہیر سے استحساناً اور استبداداً رجوع کرنا پڑتا ہے، عقلی وادراکی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے، نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلامشارکت احد۔ ے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنالینا ہے ۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں، کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر الہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا، جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظرِ غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجے میں پکار اٹھتے ہیں:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

"شیخ مرحوم کا کہنا یہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارے میں سر سید احمد خان (مرحوم) کے ساتھ مدت العمر لڑائی جھگڑا کیا ۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا ۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم

کے قول ہیں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے!"

(پنجاب ریویو، مارچ، اپریل ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۰ - ۱۱)

علی گڑھ کے اس خطبے کے بعد اکبر اور اقبال کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اقبال، اکبر کو اس نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں، جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے؛ وہ ان کے خطوں کو قیمتی متاع سمجھ کر محفوظ رکھنے اور تنہائی میں انہیں اپنا ندیم سمجھنے لگتے ہیں۔

اکبر اور اقبال کا یہ رابطہ ایک اور لحاظ سے بھی قابلِ ذکر ہے یہ رابطہ ایک ایسے زمانے میں ہوا۔ جب اقبال ایک زبردست روحانی کشمکش سے گزر رہے تھے۔ اقبال کے ذہن و فکر میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ان کے قیام یورپ کے دوران ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ اس تبدیلی کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جنہیں تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے "ایران میں مابعد الطبیعیات" کی تحقیق کے دوران عجمی تصوّف کے بعض ایسے منفی پہلو ان کے سامنے آئے جنہوں نے شعر و ادب کے راستے داخل ہو کر ملّت اسلامیہ کے زوال میں حصّہ لیا۔ اقبال اس وقت تک خود وحدت الوجودی تھے، اس تغیّر کے بعد وہ اس تصوّر سے دست بردار ہو گئے۔

۲۔ مغرب کے مادّی فلسفوں اور علم الحیات کے نئے نظریوں نے الحاد کے جن دروازوں کو کھولا، اور کلیسائی نظامِ سیادت کے زوال کے ساتھ وطنی قومیت TERRITORIAL NATIONALISM کا جو تصوّر وہاں ابھرا، وہ نوعِ انسانی کی بربادی کا پیش خیمہ نظر آنے لگا۔ مغرب کی استعماری یلغار کے ساتھ ہی ہماری مشرق کا رُخ کر رہی تھی۔ یہ مسئلہ تشویشناک صورت اختیار کر چکا تھا۔

۳۔ بعض اسلامی ممالک میں احیائی تحریکوں کا آغاز اور اتحادِ عالمِ اسلامی کا رجحان جو مغرب کی استعماریت کے پھیلاؤ کے ساتھ ردِّ عمل کے طور پر اُبھر رہا تھا اقبال اس سے بھی متاثر ہوئے۔

یہ وہ امور ہیں جنہوں نے اقبال کے ذہن میں ایک بڑا انقلاب پیدا کیا، اس انقلاب کے بارے میں بعد میں ایک موقع پر انہوں نے کہا کہ "یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا"۔ قلب و ذہن کی اس تبدیلی کا اظہار اقبال نے زمانۂ قیام یورپ ہی میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۰۷ء کے بعض اشعار (مشمولہ بانگِ درا) سوشیالوجیکل ریویو لندن میں "اسلام اور خلافت" پر آرٹیکل، اور اسلامی تہذیب و تمدن پر انگلستان میں ان کے خطبات کا سلسلہ اس کا ثبوت ہیں۔ زوالِ اُمت کے اسباب پر غور و فکر کا یہ رجحان لے کر اقبال واپس وطن پہنچے، یہاں آکر وکالت کی کاروباری مصروفیات کے ساتھ وہ اس قومی درد و کرب سے بھی دوچار رہے، جس نے انہیں کئی برس تک بے تاب رکھا۔ اس قومی سوز و درد کا اظہار اقبال نے اس زمانے کے اپنے بعض خطوں میں بھی کیا ہے (خصوصاً اکبر کے نام) ہندوستان ریویو میں مضامین اور خطبۂ علی گڑھ بھی انہی احساسات کا عکس پیش کرتے ہیں، طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے دوران جذبات کا لاوا شاعری کی صورت میں اُبلنے لگتا ہے بہرکیف اس باطنی کشمکش کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ زوالِ امت کی تشخیص کے بعد علاج کا مرحلہ آتا ہے اور اسرار و رموز کی صورت میں یہ تشخیص و علاج منظرِ عام پر آجاتے ہیں اور معاصرین کو بھی قدرے آسودگی ملتی ہے۔

اس روحانی و باطنی کشمکش کے دوران اکبر کے افکار سے بھی اقبال کو بڑی مدد ملی جس کا اعتراف خطبۂ علی گڑھ میں بھی انہوں نے کیا ہے اور بعد میں خطوں میں بھی وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

اکبر کی نظم "برقِ کلیسا" ۱۹۰۷ء میں تخلیق ہوئی اس نظم کا ایک شعر ہے:

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

"اسرارِ خودی" میں حافظ شیرازی کے بارے میں اقبال کے موقف کو اس شعر کے حوالے سے دیکھیں تو اس معاملے میں اکبر اور اقبال کے خیالات میں کوئی تفاوت نظر نہیں آئے گا۔ وہی بات جو بعد میں اقبال نے شرح و تفصیل سے بیان کی، اکبر نے آٹھ سال پہلے بڑے اختصار سے دلکش پیرائے میں بیان کر دی ہے اگرچہ اسی اعتراضِ حافظ پر اقبال اور حسن نظامی کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی تو اکبر کو ثالث بالخیر کا کردار ادا کرنا پڑا اور وہ حافظ پر اقبال کے اس حملے سے جز بز بھی ہوئے۔

پھر اکبر کے کلام میں اس قسم کے اشعار کو دیکھئے:

مذہب سوسائٹی ہے اور دینِ آخرت ہے
پولٹیکل جو پوچھو، طاقت ہے اور سکت ہے

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے
اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط ایک جبر ہے

نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت
تو وہ کیا ہے فقط اِک فلسفہ ہے

ان اشعار کے مطالب پر غور کریں اور اقبال کے کلام پر نگاہ ڈالیں، تو نصب العین کے اعتبار سے اکبر اور اقبال ایک ہی انداز میں سوچتے نظر آتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اکبر اس زمانے میں یہ باتیں بڑے عاجزانہ انداز میں کہہ

رہے تھے جب ساری خدائی ایک طرف تھی تو اکبر بیکس وتنہا دوسری طرف قومی فکر کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے تھے جب کہ اقبال نئے دور کے سیاسی شعور، اور قومی جد وجہد کے ماحول میں خودی اور توانائی کا نظریہ پیش کر کے ملت اسلامیہ میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور تاریخ عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کا سبق اور دعوت عمل دے رہے تھے اس فلسفۂ حیات کی تشکیل میں اکبر کے اثر کا اعتراف موخر الذکر شعر کے حوالے سے اقبال اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں :

"مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے"۔ یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کے لیے یہی خیال محرک ہوا، میں گزشتہ دس سال سے اسی پیچ وتاب میں ہوں"۔

(خط بنام اکبر، مورخہ ۱۸، اکتوبر ۱۹۱۵ء)

ضمیمہ جات

ضمیمہ الف:

اقبال نے "نیو ایرا" میں STRAY THOUGHTS کے زیرِ عنوان لسان العصر
اور ہیگل کے بارے میں جو مضمون لکھا، وہ درج ذیل ہے:

TOUCH OF HEGELIANISM IN *Lisanul Asar*, AKBAR

To the great German idealist Hegel creation means the Absolute Reason leaving its absoluteness and returning to itself by visualising or objectifying itself in the form of a Universe which, in its essence, is no more than the unity of the Absolute Reason powdered up in a visible, perceptible plurality. Whether this process of return is temporal or non-temporal (for on this point Hegelians differ) it is clear that according to the Master its motive-force is the necessarily self-contradictory categories through which the Absolute Reason has to pass synthetically to regain its primeval Absoluteness. At the beginning of the process, since we are distant from the origial Absoluteness the contradictions are sharp and mutually exclusive, but when we approach the end of the process their sharpness begins to disappear until we reach the Absolute idea in which all contradictions embrace each other, and are transformed into a single unity. Thus the central idea of Hegel's Philosophy can be summed up in a few words—Infinite becoming Finite and regaining itself through a synthesis of self-evolved oppositions. The life of the universe, then, is necessarily constituted by a perpetual conflict of opposing forces. This brief sketch of Hegel's idea, I am afraid,

is not quite luminous, but I venture to hope it will assist you in realising the depth of Akbar's apparently simple verse:

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

The endless conflict of Nature's creative force is too palpable to escape the observation of poets and thinkers. Tennyson has perhaps given it a fuller and more pathetic expression; and our own Urfi has seized it in a majestic verse:

بچشم مصلحت بنگر مصاف نظم ہستی را
کہ ہر خارے دریں وادی درفش کاویان بینی

The special feature of Akbar, however, is that in a few simple and well-chosen words he reveals to you not only the conflict, but also the cause (i.e. Limitation of the Limitless) which has generated it. And in the words عقل and عقیدہ he further suggests that this conflict is not limited to the material Plane (عنصر) only, but extends itself to the mental plane as well. In Alexander's well-known book: *Moral Order and Progress*, you will find how our ideas, ideals, beliefs and modes of life are constantly engaged in a quiet, bloodless fight, and how they displace, kill and absorb one another.

ضمیمہ ب :

اکبر کی نظم "صوفی اور مُلّا" "معارف" اپریل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں "کلیاتِ اکبر" حصۂ سوم میں شامل کی گئی، (صفحہ ۱۸۳، ۱۸۴

طبع پنجم الٰہ آباد ۱۹۴۰) جس پر یہ نوٹ بھی ہے:

"زیادہ بے لطفی ہو چلی تھی اس وقت یہ اشعار معارف نے چھاپے۔ ورنہ نصیحت اور امر بالمعروف ہمیشہ چاہیئے"۔

فریادِ اکبر

ناگپور جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے الٰہ آباد اُترنے کا اتفاق ہوا اور یہ وقت جناب سید اکبر حسین صاحب کی مُلاقات میں صرف ہُوا، ناظرین کے لئے اس ملاقات کا بہترین تحفہ نظم ذیل ہے۔ (سُلیمان ندوی)

اس وقت مولویت صوفی سے بھڑ گئی ہے — اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے
مُلّا کو زعم ہے یہ دانم چرا نہ گویم — صُوفی کو یہ کہ دارم پاتے چرا نہ پویم
مُلّا یہ کہہ رہے ہیں، میرا رسالہ دیکھو — صُوفی کا ہے اشارہ میرا پیالہ دیکھو
مُلّا یہ کہہ رہے ہیں، قرآن ہی سے پڑھیئے — صُوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھیئے
مُلّا پکارتے ہیں منطق کی جنگ اچھی — صُوفی کا ہے ترانہ حق کی ترنگ اچھی
اس جنگ میں ہے بیشک نادانی سیاسی — یہ بات ہے یقینی، ہرگز نہیں قیاسی
گو قیدِ ظاہری کی پاتے ہیں اُن میں قلّت — وہ بھی جماعتیں ہیں، یہ بھی ہے نظمِ ملّت[۱]

۱۔ "کلیات": وہ بھی ہے نظمِ ملّت

اپنے[1] طریق میں تو ہر سمت ابکمی ہے — مجلس میں ہے تزلزل، میلوں میں بھی ہے
کہتے ہیں کر رہے ہیں، ہم یہ ریفارمیشن — دیکھا نہیں تھا لیکن، مردوں پہ آپریشن
بازو قوی جو رکھتے، ہوتی اگر حکومت — اس وقت شاید آتی کچھ کام یہ خصومت
تنگیِ رزق نے تو چرخے دیئے ہیں کتوا — کیسی دلیل شرعی، کیسا خرد کا فتوے
ہوتا رہے گا نشتر، پہلے جلا تیے تو — جانِ حزیں کو اُن کے تن سے ملا تیے تو
ہے ہاتھ میں قلم بھی، مُنہ میں زبان بھی ہے — لیکن یہ دیکھئے تو حضرت میں جان بھی ہے
وضعِ کہن کا مٹنا، اُس کی یہ رُت نہیں ہے — تیشے سے توڑ دو تم ایسا یہ بُت نہیں ہے
اس وقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں ہیں — آپس میں گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں
بہتر ہے کام لینا نعماتِ موعظت سے — رو کو گلے کو لیکن ایسی جلت پھرت سے
شیعہ ہوں خواہ سُنی، مُلا ہوں خواہ صُوفی — بے سود بحث[2] باہم ہے سخت بیوقوفی
باتیں نئی کہاں سے لاکر کوئی کہے گا — تم بھی وہی رہو گے وہ بھی وہی رہے گا
دیکھو ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے — موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے

وقتِ نزاعِ باہم ہرگز نہیں ہے یارو
اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو

---

[1] ۔ دینی ۔ [2] ۔ جنگ (کلیات)

کتبِ حوالہ

۱۔ اقبال نامہ، حصّہ اوّل، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور۔

۲۔ اقبال نامہ، حصہ دوم، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور، 1951ء

۳۔ اقبال نامہ، مرتبہ چراغ حسن حسرت، مطبوعہ لاہور۔

۴۔ انوارِ اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار، کراچی ۱۹۶۷ء

۵۔ باقیاتِ اقبال، مرتبہ سید عبد الواحد، طبع لاہور۔

۶۔ حیاتِ اکبر، ترتیب سید عشرت حسین، مسعود ملا، ندی، کراچی۔

۷۔ خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی، بار سوم ۔۔ المطابع دہلی، ۱۹۵۳ء

۸۔ خطوط مشاہیر، مرتبہ عبد الماجد دریا بادی، طبع لاہور (تاج کمپنی، بار سوم)

۹۔ رقعاتِ اکبر، مرتبہ محمد نصیر ہمایوں، لاہور۔

۱۰۔ سرودِ رفتہ، مرتبہ غلام رسول مہر، طبع لاہور۔

۱۱۔ سیرتِ اقبال، طاہر فاروقی، لاہور ۱۹۶۶ء۔

۱۲۔ شادِ اقبال، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور، طبع حیدر آباد۔

۱۳۔ کلیاتِ اقبال، (اردو) طبع لاہور۔
۱۴۔ کلیاتِ اقبال، (فارسی) طبع لاہور۔
۱۵۔ کلیاتِ اکبر، حصہ اوّل تا سوم، مطبع اسرار کریمی الہ آباد، ۱۹۴۰ء
۱۶۔ کلیاتِ اکبر، جلد چہارم، کراچی
۱۷۔ مکاتیبِ اقبال (بنام گرامی) مرتبہ عبداللہ قریشی، مطبوعہ اقبال اکیڈمی، ۱۹۶۹ء
۱۸۔ مکاتیبِ اقبال (بنام نیاز الدین خان) مطبوعہ بزمِ اقبال لاہور ۱۹۵۴ء
۱۹ مکاتیبِ اکبر (بنام عزیز لکھنوی) ادبی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۲ء
۲۰۔ مکتوباتِ اکبر، مرتبہ مرزا سلطان احمد، مطبوعہ کریمی پریس لاہور۔
۲۱۔ نوادرات بہ اسلم جیراجپوری
۲۲۔ THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL
۲۳۔ رسائل: مخزن، پنجاب ریویو، معارف، زمانہ، اقبال، اقبال ریویو (متفرق پرچے) صحیفہ (اقبال نمبر ۱۹۷۳ء)، علی گڑھ میگزین (اکبر نمبر ۱۹۵۰)
